سانپ کی آنکھ

سانپ کی آنکھ

نونہال ادب

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی

سانپ کی آنکھ

واتا سے جنکو

پُرانے زمانے میں ایک گاؤں میں ایک لکڑہارا رہتا تھا۔ اس کا نام جِنپاچی تھا۔ ایک دِن جِنپاچی پہاڑ سے اپنے گھر واپس آ رہا تھا۔ جب وہ جنگل میں پہنچا تو اُس نے سامنے ایک درخت پر عجیب و غریب چیز دیکھی۔ کوئی زندہ کالی کالی چیز درخت پر بندھی ہوئی تھی۔ جِنپاچی پہاڑی سے خوب واقف تھا

مگر وہ ڈر گیا اور دُور ہی سے اُس کو دیکھتا رہا۔ غور سے دیکھنے پر جب جِنپاچی کو معلوم ہوا کہ وہ چیز ایک جوان عورت ہے تو جِنپاچی آہستہ آہستہ اُس کے نزدیک آیا۔ وہ عورت کالے رسّے سے بندھی ہوئی تھی۔ جِنپاچی نے سوچا کہ عجیب بات ہے اور اُس کے پاس پہنچا تو یہ پتا چلا کہ وہ کالا رسّا تو اصل میں اُسی عورت کے بال تھے! جِنپاچی حیرت سے وہاں کھڑا رہ گیا۔ عورت اپنے بالوں سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ بے ہوش تھی اور اُس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ جِنپاچی کو یہ عورت بہت مجبور معلوم ہوئی۔ خوف سے کانپتے ہوئے اُس نے رسّا کھول دیا۔ وہ عورت گر پڑی اور آہستہ آہستہ اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اُس کی آنکھیں پہاڑی جھیل کی طرح صاف و شفّاف تھیں؟

"کیا معاملہ ہے؟" جِنپاچی نے پوچھا تو اُس عورت کے خوب صورت گالوں

پر آنسو بہنے لگے اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟" جِنپاچی نے پوچھا مگر وہ روتی رہی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ جِنپاچی کُچھ دیر اُس کو دیکھتا رہا، مگر پھر دِل پر جبر کرتے ہوئے عورت کے پاس سے جانے والا ہی تھا کہ اُس عورت نے کہا۔

"کُچھ دیر اور ٹھہر یے، مُجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔"

جِنپاچی نے سوچا کہ اُس کو اِس جنگل میں اکیلے چھوڑنا خطرناک ہے۔ اور وہ عورت کو اپنے گھر لے گیا۔ یُوں جِنپاچی اُس عورت کے ساتھ رہنے لگا۔ اُس عورت نے بڑی محنت سے جِنپاچی کی دیکھ بھال کی۔ جِنپاچی بن بیاہا تھا اِس لیے وہ اُس کا بہت شکر گزار تھا۔ مگر عورت نے اپنے بارے میں اُسے کوئی بات نہیں بتائی۔ جِنپاچی نے سوچا کہ شاید اِس کا کوئی سبب ہو گا اور اُس سے کُچھ نہیں پوچھا اور اس عورت کے ساتھ رہتا رہا۔

ایک دِن جِنپاچی نے اُس سے کہا، "میرا جی چاہتا ہے کہ تُم سے شادی کر لوں۔"

اُس عورت نے کُچھ سوچ کر کہا۔ "میں بہت خوش ہوں لیکن اگر آپ مُجھ سے اِس بات کا وعدہ کریں کہ میرے بارے میں کوئی بات نہیں پوچھیں گے تو میں آپ کی بیوی بن کر رہوں گی۔"

جِنپاچی نے وعدہ کر لیا اور اُس عورت سے شادی کر لی۔

جب اُن کے ہاں بچّے کی پیدائش ہونے والی تھی تو ایک دِن عورت نے جِنپاچی سے درخواست کی کہ گھر کے چاروں طرف دیوار بنا دیجیے اور جس وقت تک میں اپنے بچّے کے ساتھ گھر سے نہ نِکلوں اُس وقت تک آپ گھر کے اندر رہر گز نہ دیکھیے۔ اُس کی مرضی کے مطابق جِنپاچی نے اپنے گھر کے چاروں طرف ایک دیوار بنا دی اور وہ عورت اُس گھر کے اندر چلی

گئی۔ چناں چہ وعدہ کے مطابق باہر اُس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر دو تین دِن گُزر گئے تو جِنپاچی کو پریشانی ہوئی کہ بیوی کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہوا ہو۔ اور جِنپاچی نے احاطے کے ایک چھوٹے سے سوراخ سے جھانک کر اندر دیکھا۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی۔ گھر کے اندر ایک بڑا سانپ ایک ننھّے مُنّے بچّے کے پاس لیٹا ہوا تھا۔ جِنپاچی گھر سے کُچھ دُور ہٹ آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ عورت تو سانپ تھی مگر میں نے اُس سے شادی کر لی۔ پھر میں نے اُس سے وعدہ خلافی کی اور اِس کا مُجھے بہت افسوس ہے۔ اب مُجھے کیا کرنا چاہیے؟

سات دنوں کے بعد وہ خوب صورت عورت ایک پیارا سا بچّہ لیے ہوئے گھر سے باہر آئی۔ جِنپاچی سے مِل کر روتے ہوئے اُس نے کہا۔ "آپ نے مُجھ سے وعدہ کیا تھا پھر آپ نے جھانکا کیوں تھا، اب میں آپ کو اپنا

رازبتاتی ہوں۔ پہاڑ کا ایک دیوتا مُجھ سے ناراض ہوگیا تھا اور مُجھے سانپ کی صورت میں بدل دیا۔

ایک بار میں انسان بن سکتی تھی۔ اگر مُجھ سے سچّی محبّت کرنے والا اپنے وعدے کو وفا کرتا تو میں دوبارہ پوری زندگی کے لیے انسان بن سکتی تھی، مگر آپ نے وعدہ وفا نہیں کیا، اِس لیے میں اب انسان نہیں رہ سکتی اور اب مُجھے پہاڑی جھیل تک واپس جانا ہے۔ اب آپ اِس بچّے کو پیار سے پالیے۔" یہ کہتے کہتے اُس عورت کے پاؤں سانپ میں بدلنے لگے۔ جِنپاچی نے روتے ہوئے اُس سے معافی مانگ کر بچّہ اپنی گود میں لے لیا اور کہا۔ "اب تمہارے بغیر میں اِس بچّے کو کیسے پال سکوں گا؟"

"جب بچّہ روئے تو یہ آنکھ اُس کے ہونٹوں سے لگا دینا۔" یہ کہہ کر عورت نے اپنی ایک آنکھ نکال کر جِنپاچی کو دے دی۔ خود ایک بڑے سانپ

میں بدل گئی اور پھر دِل میں دُکھ لیے ہوئے پہاڑ کی طرف چلی گئی۔

جِنپاچی نے بچّے کا نام بوترو رکھا اور ماں کی آنکھ اُس کے ہونٹوں سے لگا لگا کر اس کو پالا۔ ماں کی محبّت سے بھری ہوئی آنکھ کے حیرت انگیز اثر سے بوترو برابر بڑھتا رہا۔ مگر اُس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ آنکھ چھوٹی ہوتے ہوتے آخر میں غائب ہو گئی۔ آنکھ کے گُھل جانے کے بعد بوترو ہر وقت روتا رہتا تھا۔ وہ کسی بات یا چیز سے نہیں بہلتا تھا۔ جِنپاچی پریشان ہو کر بوترو کو لے کر اُس کی ماں کی تلاش میں پہاڑی جھیل پر گیا۔

پہاڑ کے درمیان راستے میں ایک جھیل دیکھی تو اُس کے کنارے جا کر کہا:

"بوترو کی ماں، تُم کہاں ہو؟"

پھر جھیل سے ایک بڑا سانپ نکلا۔ جِنپاچی نے کہا۔

"تمہارے جانے کے بعد تمہاری آنکھ سے یہ بچّہ پل رہا تھا۔ مگر اب تمہاری آنکھ کے بغیر یہ بچّہ برابر روتا رہتا ہے۔"

سانپ نے دُکھ کے ساتھ یہ بات سُنی اور کہا۔

"اب میں اپنی دوسری آنکھ دوں گی مگر دونوں آنکھوں کے بغیر وقت کا اندازہ نہیں کر سکوں گی۔ اس لیے جھیل کے نزدیک ایک گھنٹہ رکھ دیجیے تاکہ مُجھے اُس سے وقت کا پتا چلتا رہے۔"

سانپ نے روتے ہوئے اپنی دوسری آنکھ بھی نکال کر بوترو کو دی اور کہا۔

"میری تمنّا ہے کہ تُم تن درستی کے ساتھ جوان ہو۔ میں تُم سے جدا ہونا

نہیں چاہتی مگر یہ تو میری قسمت کی خرابی ہے۔ ہر وقت تمہاری حفاظت کرتی ہوں۔"

وہ اپنی آنکھ سے آنسو اور خون بہاتے ہوئے جھیل میں غائب ہو گئی۔

بوترو میں اُس وقت سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ ماں کی آنکھ دوبارہ ملتے ہی خوشی

سے ہنسنے لگا۔ جِنپاچی نے جھیل کے نزدیک ایک مندر کو بڑا گھنٹہ دیا اور صُبح و شام وہ گھنٹا بجا کر سانپ کو وقت بتانے لگا۔ دونوں آنکھوں کے گھلنے کے ساتھ بوترو بڑھتا گیا۔ جب وہ دس سال کا تھا تو اُس نے سوچا کہ اُس کی ماں کیوں نہیں ہے۔ اُس نے باپ سے پوچھا۔ جِنپاچی نے اُس کی ماں کا راز بوترو کو بتا دیا۔ یہ سُن کر بوترو سوچنے لگا کہ اگرچہ میری ماں سانپ ہے لیکن اُس سے ضرور ملنا چاہیے۔

ایک دِن بوترو گھر سے نکل کر پہاڑی جھیل ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ جھیل کے پاس اُس نے اُونچی آواز سے پکارا۔

"ماں! آپ کہاں ہیں؟ آئیے!"

تو پُر سکون جھیل کے پانی میں ہل چل ہوئی اور ایک بغیر آنکھوں والا سانپ پانی سے نکلا۔ بوترو کو کُچھ ڈر لگا۔ وہ سہم کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ سانپ اپنی

گردن ہلاتے ہوئے بوترو کے نزدیک آیا، مگر اندھا ہونے کی وجہ سے بوترو کے پاس سے گُزر گیا۔ بوترو نے بے اختیار ہو کر ہلکے سے پُکارا۔

"ماں!"

جاتے ہوئے سانپ نے پلٹ کر اِس آواز کی طرف اپنی گردن موڑی۔ بغیر آنکھوں والے سانپ کا غم زدہ چہرہ دیکھ کر بوترو کو اُس پر انسان کا گمان ہوا۔ بوترو نے اچانک ماں کہہ کر سانپ کی گردن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور رونے لگا۔ بوترو کے آنسو سانپ کی آنکھوں کی خالی جگہ میں گِرے تو سانپ عورت کی صورت میں بدل گیا۔ اور پھر آنکھیں بھی واپس آ گئیں۔ ماں نے کہا :

"بوترو تُم پہاڑ پر اِس طرح اکیلے آ گئے اور ایسی بد نُما ماں کو آغوش میں لے لیا۔ تمہاری محبّت سے پہاڑ کے دیوتا کی بد دُعا کا اثر جاتا رہا۔ مُجھے پھر انسان

کی صورت مل گئی!"

یہ کہہ کر بوترو کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ پھر بوترو اور اُس کے ماں باپ خوشی خوشی رہنے لگے۔

پہلے کسے

س,م دانش

آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل ۱۷۳۹ء کی بات ہے۔ اُس وقت مُغلیہ بادشاہوں کی حکومت کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ نادر شاہ دُرّانی جب دہلی کو فتح کرنے کے لیے بڑھا تو اُس وقت مُغلیہ سلطنت کی باگ ڈور محمد شاہ کے ہاتھوں میں تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حکومت کے کاموں اور

عوام کی فلاح و بہبود کے کام انجام دینے کے بجائے محمد شاہ رقص و موسیقی کی محفلوں میں گُم رہتا تھا۔ انہی دلچسپیوں کی وجہ سے وہ اپنی رعایا میں رنگیلے شاہ کے لقب سے مشہور ہوگیا۔

محمد شاہ رنگیلے کی دلچسپی کی کمی اور بے توجہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوج کے سپہ سالار (کمانڈر) اور سپاہی اور دوسرے افسران بھی اپنے اپنے فرائض سے غفلت برتنے لگے۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نادر شاہ اپنی چاق وچوبند اور بہادر فوجوں کی مدد سے دہلی کو فتح کرلیتا۔ محمد شاہ نے اپنی واضح اور صاف شکست کو دیکھتے ہوئے صلح اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ نادر شاہ نے اپنی شرطوں کے ساتھ ایک سفیر اس کے پاس بھیجا اور محمد شاہ نے یہ شرطیں مانتے ہوئے صلح کرلی۔

صُلح کے بعد لال قلعہ دہلی کے ایک خوب صورت ایوان میں دونوں حکمران

اپنے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ اِسی دوران محمد شاہ نے ایک خادم سے قہوہ پیش کرنے کو کہا۔

کچھ ہی دیر گُزری تھی کہ خادم سونے کی منقّش پیالوں میں قہوہ لیے حاضر ہوا مگر محفل میں پہنچنے کے بعد وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ ایوان میں دو بادشاہ موجود تھے۔ ایک اس کا آقا اور دوسرا مہمان فاتح نادر شاہ۔ وہ سوچنے لگا کہ

پہلے کِسے قہوے کا پیالہ پیش کرے۔ اگر اپنے آقا کو پیش کرتا ہے تو نادر شاہ کے ناراض ہونے کا اندیشہ ہے، جسے خود محمد شاہ بھی ناراض نہیں کرنا چاہے گا اور اگر نادر شاہ کو پہلے قہوے کا پیالہ پیش کرتا ہے تو آقا کی سُبکی ہونے کا اندیشہ ہے۔۔۔۔ وہ اِس سوچ میں غرق تھا۔ اُس کی ذہنی کیفیّت کو دونوں بادشاہ بھی سمجھ گئے تھے اور وہ بھی مُنتظر تھے کہ دیکھیں خادم کیا فیصلہ کرتا ہے۔

کچھ دیر تک غور کرنے کے بعد خادم نے آخر اِس پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کر ہی لیا۔ وہ اپنے آقا محمد شاہ رنگیلے کی طرف بڑھا۔ شاہی آداب بجا لا کر اس نے کہا:

"جہاں پناہ! آپ کو تو اِس غلام کی اوقات کا بخوبی علم ہے۔ بھلا میری مجال کہاں کہ آپ کے معزّز مہمان کی خدمت میں خود قہوے کا پیالہ پیش کر

سکوں۔ میری آپ سے التجا ہے کہ اپنے معزّز مہمان کی تواضع کرنے کی سعادت خود حاصل فرمائیں اور اپنے مبارک ہاتھوں سے مہمانِ عالی وقار کی خدمت میں قہوہ پیش کریں۔"

محمد شاہ رنگیلا خادم کی اِس حاضر دماغی اور عقل مندی سے بہت خوش ہوا۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے قہوے کا پیالہ لے کر نادر شاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نادر شاہ بھی خادم کی ذہانت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے محمد شاہ کو مخاطب کر کے کہا:

"اس خدمت گار کی طرح اگر آپ کے دوسرے امیر، وزیر اور حکام بھی ذہین اور قابل ہوتے تو آج میری فوجیں دہلی پر کسی بھی حالت میں قبضہ نہیں کر سکتی تھیں۔"

محمد شاہ اپنے خدمت گار کی اس تعریف پر بہت خوش ہوا۔ لال قلعے سے

رُخصت ہوتے ہوئے نادر شاہ نے اِس ذہین خادم کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو محمد شاہ انکار نہ کر سکا۔ اُس خادم کا نام عبد اللہ افغانی تھا، جو نادر شاہ کی فوج میں پہنچ کر سالارِ اعلا (کمانڈر ان چیف) کے عہدے پر فائز ہوا۔

لافانی چراغ

ابرار محسن

وہ ایک بہت بڑا بادشاہ تھا۔ اس کا ایک عالیشان محل تھا۔ اس کا خزانہ سونا چاندی اور جواہرات سے بھرپور تھا۔ دُنیا کا ہر عیش و آرام اُسے میسّر تھا، پھر بھی اُسے دِل کی خوشی حاصل نہ تھی۔ وہ تیزی سے بُوڑھا ہو رہا تھا اور اُسے یہی فکر ستاتی رہتی تھی کہ اُس کے بعد تخت و تاج کا وارث کون ہو گا۔

آخر ایک دِن اُسے وہ خوشی بھی حاصل ہو گئی۔ محل کی کنیزوں نے اسے بیٹے کی پیدائش کی مبارک باد دی۔ کنیزوں کی جھولیاں سونے چاندی اور مُنہ موتیوں سے بھر دیے گئے۔ محل قہقہوں سے گُونج اٹھا۔ شادیانے بجنے لگے۔ بادشاہ نے خوشی سے جھوم کر کہا :

"آج کا دِن میری زندگی کا سب سے پیارا اور یادگار دِن ہے۔ میرا حُکم ہے کہ سارے شہر میں جشن منایا جائے اور جشن ایک سال تک جاری رہے۔ شہر بھر کو پھولوں سے سجایا جائے۔ ہر گھر میں گیت گائے جائیں۔ لوگ بہترین کپڑے پہنیں اور ہر گھر ہر سڑک، گلی اور کوچے میں چراغاں ہو۔ جس گھر کو سب سے زیادہ خوبصورت طریقے سے روشن کیا جائے گا اُس کے مالک کو مالا مال کر دیا جائے گا۔ آج رات کو ہی میں خود گشت لگا کر ایسے گھر کا انتخاب کروں گا۔"

اُس دِن سورج غروب ہوتے ہیں تمام شہر جگمگانے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جھلملاتے ہوئے ستاروں کا ایک اور آسمان شہر پہ اُتر آیا ہو۔ ہر گھر میں بے شمار چراغ روشن تھے، اوران کے اندر سے گیتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شہر اُس رات پرستان کا کوئی خطہ معلوم ہورہا تھا۔

بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ شہر کے گشت پر نکلا۔

وہ دونوں ایک ایک گھر کا بغور مطالعہ کرتے۔۔۔۔ اور آگے بڑھ جاتے۔ شہر کے لوگوں نے واقعی دِل سے چراغاں کیا تھا۔ امیروں کے خوبصورت مکانوں میں مومی شمعوں اوراصلی گھی کے چراغوں کی خوشبودار روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ غریبوں نے بھی اپنی بساط کے موافق کڑوے تیل سے مٹّی کے دیے جلائے تھے۔ بادشاہ نے سفید پتھرّ سے بنے ایک مکان کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا۔ "وہ دیکھو کس قدر حسین منظر ہے۔ اِس کی قندیلیں

جواہرات کی طرح جگمگا رہی ہیں۔"

وزیر بولا۔ "اور وہ دوسرا مکان جو سُرخ پتھرّ سے بنا ہے، اُس میں کافور کی شمعیں جل رہی ہیں۔ کیسی دودھ جیسی سفید اور ٹھنڈی روشنی ہے۔"

بادشاہ نے دوسری طرف نگاہ اُٹھا کر کہا۔ "وہ سُنہری عمارت دیکھو۔ اس کے چراغوں کا تو جواب ہی نہیں۔"

بادشاہ نے کہا:

"ہر گھر کا چراغاں لاجواب ہے، اب یہ فیصلہ کسی طرح ہو کہ کون سا بہترین ہے؟ انعام کسے دیا جائے؟"

"ذرا سنبھل کر چلیں جہاں پناہ۔" وزیر نے ادب سے کہا، سڑکیں اندھیری ہیں۔ چوں کہ انعام سب سے اچھّے روشن گھر کے لیے ہے اِس لیے

سڑکوں کی طرف کسی نے توجّہ ہی نہیں کی ہے۔"

چلتے چلتے وہ شہر کی فصیل کے پاس تک آپہنچے۔

بادشاہ نے حیرت اور ناگواری سے کہا، "وہ دیکھ رہے ہو؟ وہ جھونپڑی اندھیری ہے۔
چراغاں کی شب میں جھونپڑی تاریک رکھنے کی گُستاخی کس نے کی ہے؟"

نزدیک آکر اُنھوں نے دیکھا کہ جھونپڑی کے دروازے یہ ایک بُوڑھا بیٹھا تھا اور اُس کے پاس سڑک کے کنارے مٹّی کا ایک چراغ روشن تھا۔

وزیر نے بُوڑھے کو مخاطب کیا۔ "بے وقوف! بادشاہ کا حُکم ہے کہ تمام گھروں میں چراغاں ہو اور سب سے زیادہ اچھّے روشن گھر کو انعام واکرام سے نوازا جائے گا مگر تُو نے جھونپڑی میں اندھیرا کر رکھا ہے!"

بُوڑھے نے کھانستے ہوئے جواب دیا :

"میرے پاس صرف ایک ہی مٹّی کا دِیا تھا، جب میں نے دیکھا کہ اپنے گھروں میں چراغاں کرنے کی دُھن میں لوگوں نے سڑکوں کو تاریک ہی چھوڑ دیا ہے تو میں نے اپنا وہی دِیا سڑک کے کنارے لا کر رکھ دیا تاکہ راہ گیر اندھیرے میں ٹھوکریں نہ کھائیں۔"

بادشاہ نے کُچھ دیر سوچ کر کہا۔ "اِس جھونپڑی کا چراغ سب سے زیادہ روشن ہے۔ انعام اس بُوڑھے کو ملے گا، سفید اور سُرخ پتھروں کی عمارتوں میں جلنے والی قیمتی قندیلوں کی روشنی اُن کی دیواروں ہی میں قید ہے اور یہ مٹّی کا دِیا دوسروں کے لیے روشن ہے۔ یہ دِیا نہیں بلکہ سورج ہے جس کی روشنی کسی ایک گھر کے لیے نہیں ہے۔ یہ دِیا روشنی کا وہ مینارہ ہے جو راتوں کو سمندروں میں جہازوں کو منزل تک سلامت پہنچاتا ہے۔

اس کی روشنی کے سامنے تمام شہر کی قندیلیں اور شمعیں ماند ہیں۔ وزیر صاحب اُٹھا لو اِسے اور رکھ دو میرے سر پر۔ میں اِسے محل میں لے جاؤں گا جہاں یہ میرے تخت کے اوپر ہمیشہ روشن رہے گا، مبارک ہے وہ چراغ جو دوسروں کے لیے جلے۔ عظیم ہیں وہ لوگ جو اپنے گھروں کے چراغوں سے اللہ کی مخلوق کو روشنی دیتے ہیں۔"

وزیر نے دِیے کو اُٹھا کر بادشاہ کے سر پر رکھ دیا اور بولا:

"بادشاہ سلامت! آپ نے سورج سر پر اٹھا رکھا ہے۔"

"ہاں اِس کی روشنی لافانی ہے!" بادشاہ نے دھیرے سے کہا۔

نونہال منصف

ریحانہ ظفر

بہت پرانی بات ہے کسی ملک میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر چرواہے رہتے تھے۔ یہ لوگ روزانہ صُبح سویرے اپنے جانوروں کو لے کر چراگاہوں میں نکل جاتے اور شام ہونے پر گھروں کو واپس آتے تھے۔ چرواہوں کے ساتھ ان کے بچّے بھی جاتے تھے۔ مویشی سارا دِن

میدانوں میں چرتے رہتے۔ چرواہے کسی سایہ دار درخت کے نیچے اپنی محفل جماتے بچّوں کی خوب موج آ جاتی۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگتے، آنکھ مچولی کھیلتے اور تفریح کرتے سارا دِن گزار دیتے تھے۔ ایک دِن یہ بچّے کھیلتے کھیلتے کُچھ دُور جا نکلے۔ وہاں ایک چھوٹا سا ہموار میدان تھا۔ اس میں چاروں طرف گھنے درخت تھے اور میدان کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ بچّوں کو یہ جگہ پسند آئی اور انہوں نے اس جگہ کو کھیل کا میدان بنا لیا۔ اُن میں سے ایک بچّہ کھیلتے کھیلتے اچانک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے کہا۔ "میں تمہارا بادشاہ ہوں۔ تمہارے ساتھ انصاف کروں گا۔ اپنے مقدمات میرے سامنے پیش کرو۔" بچّوں نے اُس کو دیکھا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے دِن پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ ٹیلے پر آ کر بچّے نے پھر وہی الفاظ

دہرائے۔ اِس مرتبہ اُس کی آواز بھی کُچھ مختلف تھی بچّوں نے اُس کو غور سے دیکھا تو وہ بڑا سنجیدہ اور با رُعب نظر آیا۔ اُس کیفیّت کو دیکھ کر بچّے وہاں سے بھاگ نکلے۔ وہ بچّہ بھی ٹیلے سے نیچے اُتر آیا اور ایک عام بچّہ نظر آنے لگا۔

اگلا دِن آیا اور میں کُچھ پھر ہوا۔ اس مرتبہ بچوں نے بھاگنے کے بجائے کُچھ چھوٹے موٹے مقدمات تیّار کر کے بچّے کی عدالت میں پیش کیے۔ اُس نے اِن جھگڑوں پر جو فیصلہ دیا اس نے بچّوں کو حیران کر دیا۔ وہ بڑا مکمل اور صحیح فیصلہ تھا۔ جب وہ مقدمے کا فیصلہ سُنا رہا تھا تو بالکل بدلا ہوا دِکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آواز میں بڑی گرج اور دبدبہ تھا۔

بعد میں بچّوں نے یہ واقعہ اپنے بڑوں کو سُنایا۔ شروع میں تو اُنھوں نے بھی اپنے کچھ مقدمات اِس بچّے کی عدالت میں پیش کیے۔ اُس کے سنائے

گئے فیصلوں سے لوگ حیران رہ گئے کہ اتنا چھوٹا سا بچّہ کس طرح اتنے اُلجھے ہوئے اور نازک معاملات کو حل کر لیتا ہے۔ البتّہ جب وہ ٹیلے سے نیچے آتا تو بالکل سیدھا سادہ نظر آنے لگتا۔ بات پھیلتی گئی اور اس کی عدالت میں اس گاؤں کے علاوہ آس پاس کے علاقوں کے لوگ بھی اپنے مقدمات لے کر آنے لگے اور انہیں اِس نونہال منصف کی عدالت سے جلدی سستا اور پورا انصاف ملنے لگا۔

رفتہ رفتہ اُس کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی اور آخر یہ بات بادشاہِ وقت کے کانوں تک جا پہنچی۔ اُس نے آزمانے کے لیے کُچھ مقدمات لوگوں کے ذریعہ سے نونہال کی عدالت میں بھجوائے۔ اُن مقدموں کے فیصلوں نے بھی سب کو حیران کر دیا۔ بادشاہ کے دربار میں وقت کے بہترین عالم دانش ور، تاریخ داں موجود تھے۔ بادشاہ نے اُن سب سے اِس سِلسلے میں

رائے مانگی۔ سب نے اپنے اپنے انداز سے رائے دی لیکن کوئی بھی اِس راز کو نہ پا سکا کہ اتنا سا بچّہ اتنا صحیح اور منصفانہ فیصلہ کس طرح کرتا ہے۔ دربار میں ایک بُوڑھے تاریخ داں بھی تھے۔ انہوں نے اپنی رائے پیش کی کہ اس ساری کہانی کا رازاُس ٹیلے میں پوشیدہ ہے جہاں جا کر بچّے کی حالت میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور وہ اچانک ہی قابل ترین منصف بن جاتا ہے۔ آخر کئی روز کی بحث کے بعد بادشاہ نے اس ٹیلے کی کھدائی کا حُکم دے دیا۔ میدانوں کا سکُون درہم برہم ہو گیا۔ جانوروں کی پناہ گاہیں ڈھا دی گئیں۔ زمین کی تہیں پلٹ دی گئیں۔ وہ نونہال منصف حسرت و یاس کی تصویر بنا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی روح جُدا کر دی گئی ہو۔ بچّے کے غم میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو اس سے انصاف مانگنے آتے تھے۔ آخر مزدوروں کے ہاتھ رُک گئے اور اُنہوں

نے اُس چیز کو پا لیا جو وہاں وجود تھی۔ وہاں سے سنگِ مرمر کا بنا ہوا ایک خوب صورت تخت بر آمد ہوا۔ تخت کے نیچے سنگِ مرمر کے پانچ پریوں کے مجسمے تخت کو سہارا دیے ہوئے تھے جِن کے پَر کھُلے ہوئے تھے۔ اِن پروں پر وہ تخت ٹِکا ہوا تھا۔ پتھرّ کی اِن پریوں کے مُنہ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے گویا پرواز کے لیے تیّار ہوں۔

تخت کو بڑی احتیاط کے ساتھ بادشاہ کے محل میں پہنچا دیا گیا۔ عالموں، دانشوروں، تاریخ دانوں نے یہ رائے دی کہ یہ تخت کسی بادشاہ کا ہے جو زبردست عادل اور مُنصف تھا۔ بادشاہ نے حُکم دیا کہ اِس تخت کو دیوانِ عام میں رکھا جائے تاکہ میں وہاں اِس پر بیٹھ کر لوگوں کے مقدمات کے فیصلے سُنا سکوں۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ پورے ملک میں تین روز تک عبادت کی جائے اور روزہ رکھا جائے۔ تیسرے دن میں باقاعدہ اِس

تخت پر بیٹھوں گا۔

تیسرے روز بادشاہ دیوانِ عام میں داخل ہوا اور تخت کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اُس نے تخت پر بیٹھنا چاہا اچانک ایک پری کا مجسمہ بول اُٹھا۔ "رُک جا اے بادشاہ۔ کیا تُو نے کبھی کسی کا حق نہیں مارا ہے؟ کیا تُو نے دوسروں کی زمین پر کبھی ناجائز قبضہ نہیں کیا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "ہاں۔"

"تو پھر تُو اِس پر بیٹھنے کا اہل نہیں ہے۔ جا تین روز اور عبادت کر، شاید تب تُو اِس قابل ہو جائے۔"

پری کے مجسمے نے یہ کہہ کر اپنے پر پھڑپھڑائے اور فضا میں پرواز کر گیا۔ اب صرف چار مجسمے رہ گئے تھے۔ تین روز مزید عبادت کی گئی۔ چھٹے روز بادشاہ اپنی رعایا کی موجودگی میں ایک بار پھر تخت کی طرف بڑھا کہ پری کے دوسرے مجسمے کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ "آ جو کُچھ تو ہے کیا صرف اپنی محنت اور صلاحیت کی وجہ سے ہے؟"

"نہیں!" بادشاہ نے مایوسی سے کہا۔

"تو تین روز اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔" پری کے مجسمے نے کہا اور فضا میں بُلند ہو کر غائب ہو گیا۔

یہی واقعہ تیسری اور چوتھی مرتبہ بھی پیش آیا۔ ہر بار پری کا دوسرا مجسمہ اُس کا راستہ روک کر اُس سے ایسا سوال کرتا جس کا جواب بادشاہ کے پاس نہ ہوتا اور پھر اس کو تین روز مزید عبادت کرنے کی ہدایت دے کر پرواز

کر جاتا۔ اب آخری پری کا مجسمہ باقی رہ گیا تھا جس پر تخت ٹِکا ہوا تھا۔ اِس مرتبہ بادشاہ کو پکّا یقین تھا کہ میں اِس پر بیٹھنے میں ضرور کام یاب ہو جاؤں گا۔

اُس دِن لوگوں کا ہجوم بھی بہت زیادہ تھا۔ بادشاہ بڑے اعتماد کے ساتھ تخت کے قریب پہنچا۔ پری کے پانچویں مجسمے کے مُنہ سے آواز گونجی: "اے بادشاہ! کیا تیرا دِل اُس معصوم بچّے کی طرح پاک صاف ہے جو اِس پر بیٹھ کر انصاف کیا کرتا تھا؟"

بادشاہ نے مُردہ لہجے میں کہا: "نہیں۔"

"تو پھر تُو اس پر بیٹھنے کا ہر گز ہر گز اہل نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر پری کے مجسمے نے اپنے پَر پھڑپھڑائے اور تخت کو لے کر آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔

اور گاؤں بچ گیا

ابرار محسن

"ڈھم۔ڈھم۔ڈھم۔ڈھم۔۔۔"

گاؤں کا بڑا ڈھول زور زور سے پیٹا جا رہا تھا اور اُس کی گونج دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ اُس کی آواز سُنتے ہی لوگوں نے اپنے اپنے کام روک دیے۔

افریقہ میں زندگی خطرات سے بھری تھی۔ جب بھی کوئی خطرہ سامنے آتا بڑا ڈھول بجا کر لوگوں کو خبردار کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کافی فاصلوں پر رکھے ہوئے ڈھول بجائے جاتے۔ اِس طرح ڈھولوں کی زبان، دور دراز علاقوں تک خطرے کا اعلان کر دیتی۔

دیہاتیوں کی زندگیوں میں سب سے بڑا خطرہ وہ خونخوار وحشی تھے جو کہ کسی بھی گاؤں پر اچانک ہی حملہ کر دیتے تھے۔ وہ گاؤں والوں کو بھالوں سے قتل کر دیتے، جھونپڑیوں کو توڑ پھوڑ ڈالتے۔ کھیتوں کو اُجاڑ دیتے اور مویشیوں کو نکال کر لے جاتے۔

"ڈھم۔ ڈھماڈھم۔ ڈھم۔!"

ڈھول کی زبان اعلان کر رہی تھی: "خبردار۔۔۔۔ ہوشیار۔۔۔۔ شہد کا درّہ۔۔۔۔ وحشی۔۔۔۔ خبردار۔۔۔۔ ہوشیار۔۔۔۔ شہد کا درّہ۔۔۔۔

وحشی۔۔۔۔خبردار۔۔۔۔!"

سردار نے گاؤں والوں کے مجمع کو مخاطب کیا: "وحشی گاؤں کی طرف آ رہے ہیں، شہد کے درّے میں سے ہو کر۔"

گاؤں سے چند میل دور ایک پہاڑ کا درّہ تھا جو کافی تنگ تھا۔ اُس میں جا بجا شہد کی مکھّیوں کے چھتّے لگے تھے۔ اِسی لیے وہ "شہد کا درّہ" کے نام سے مشہور تھا۔ وحشی اِسی درّے میں سے گُزر کر گاؤں کی طرف آتے تھے۔

گاؤں میں شور مچ گیا۔ زیادہ تر مرد شکار پر گئے ہوئے تھے۔ صرف بُوڑھے، عورتیں اور بچّے تھے جو کسی طرح بھی وحشیوں کا مُقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ اور اب وحشی اتنے قریب آ چکے تھے کہ بُوڑھوں، عورتوں اور بچّوں کا گاؤں سے بھاگ کر جانا بھی دشوار تھا۔

"اُف، آج تو ہم سب ہی مارے جائیں گے۔" سردار بے بسی سے ہاتھ مل کر کہنے لگا۔

ڈھول مسلسل اعلان کر رہا تھا: "شہر کا درّہ۔۔۔۔ وحشی۔۔۔۔ خبردار۔۔۔۔ ہوشیار۔۔۔ شہر کا درّہ۔۔۔۔۔"

عورتیں اور بچّے خوف سے پاگل ہو رہے تھے اور بُوڑھے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جمّا اور چِروا نے بھی ڈھول کی آواز سُنی۔ وہ دونوں بچپن کے ساتھی تھے، بڑے نڈر اور ذہین۔ دونوں ہی چودہ پندرہ برس سے زیادہ کے نہ تھے۔ اُنھوں نے بہت سے بہادری کے کارنامے انجام دیے۔ اتنے وحشیوں کا وہ کس طرح مُقابلہ کرتے۔

چروا نے جمّا سے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو دوست؟"

جمّا خاموشی سے بھالے کی نوک ٹھیک کرتا رہا۔ پھر بولا۔ "گاؤں پر موت کا بادل چھانے والا ہے اور گاؤں والے بد حواس ہو رہے ہیں۔ اِس سے کوئی فائدہ نہیں۔ عقل مند لوگ ایسے موقعوں پر دماغ ٹھنڈا رکھ کر خطرے سے نکلنے کی تدبیر سوچتے ہیں۔"

"ارے، جلدی سے بھاگ نکلو ورنہ سب مار دیے جائیں گے۔" یہ چِروا نے صلاح دی۔ جمّا نے سمجھایا۔ "اس طرح ہم اپنی جانیں تو بچا لیں گے مگر بُوڑھوں، عورتوں اور بچّوں کے لیے بھاگ کر جانا ممکن نہیں۔ ہم اُنہیں موت کے مُنہ میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

چِروا جھلّا کر بولا۔ "تو پھر ہم کیا کریں؟"

جمّا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "وحشیوں کو درّے پر ہی روکنا ہے۔ اُنہیں درّے سے باہر آنے نہیں دینا ہے۔"

"مگر یہ کام کرے گا کون؟ ہم صرف دو ہی تو ہیں۔" چِروا نے اُلجھ کر کہا۔

"کیا تُم ڈرتے ہو؟" جمّا نے سوال کیا۔

چِروا نے اپنے بھالے کو ہلایا پھر بولا۔ "سُنو دوست! میں نے کبھی خود کو بہادر نہیں کہا ہے، مگر میں نہ تو خود غرض ہوں اور نہ بُزدل۔ اگر گاؤں والوں کی زندگیاں بچ سکیں تو میں اپنی قربانی دینے کو تیّار ہوں۔"

جمّا نے مُسکرا کر کہا۔ "مُجھے تُم سے ہی اُمّید تھی، آؤ میرے ساتھ۔"

وہ سردار کے پاس گئے۔ جمّا نے سردار سے کہا: "گاؤں والوں سے کہو کہ اپنے مویشیوں کو لے کر سامنے والے جنگل میں چلے جائیں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔" سردار نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "جنگل تک پہنچنے سے پہلے ہی وحشی درّے سے باہر نکل آئیں گے اور سب کو مار ڈالیں گے۔"

"جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو۔" جمّا نے کہا۔ "ایک وحشی کو بھی درّے سے باہر نہیں آنے دیا جائے گا۔"

"کون روکے گا اُنہیں؟" سردار نے پوچھا۔ "تُم دونوں؟ نادان لڑکو! یہ تمھارے بس کی بات نہیں۔ اب تو کوئی بھی کُچھ نہیں کر سکتا۔"

"گھبراوَ نہیں، سردار!" جمّا نے یقین دِلایا، وحشیوں کو روکنے کا کام میرے 'میٹھے لڑاکے' کریں گے۔"

سردار حیرت سے مُنہ کھولے اُنہیں دیکھتا رہا۔ آخر اُس نے بُوڑھوں، عورتوں اور بچّوں کو حُکم دیا کہ وہ مویشیوں کو لے کر جنگل کی طرف بھاگ جائیں۔ جمّا اور چِروا درّے کے مُنہ پر پہنچ گئے۔ دونوں طرف اُونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان تنگ راستہ تھا جس میں ہزاروں چھتّے بنے ہوئے تھے، شہد سے بھرپور۔ درّے میں شور غُل سُنائی دے رہا تھا۔

وحشی اب زیادہ دور نہ تھے۔ جمّا نے چِروا سے کہا۔ "جیسے ہی وحشی نظر آنے لگیں، درّے میں پتھر برسا کر تالاب میں چھلانگ لگا دو ورنہ مکھیاں ہمیں بھی نہیں چھوڑیں گی۔"

وحشی نظر آنے لگے۔ ننگے دھڑنگے، رنگے چہروں والے، ڈراؤنے جنگلی جو بھیڑیوں جیسے خوف ناک تھے، لیکن اچانک ہی اُن پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہزاروں لاکھوں شہد کی مکھیوں نے اُن پر حملہ کر دیا اور وہ بوکھلا کر روتے، چِلّاتے درّے کے اندر ہی لوٹ پڑے مکھیوں نے دُور تک اُن کا تعاقب کر کے اُنہیں اَدھ مُوا کر دیا۔

اگلے دِن گاؤں والوں کے سامنے سردار کہہ رہا تھا۔ "کل گاؤں کا آخری دِن ہوتا، مگر جمّا اور چِروا نے جس بہادری اور عقل مندی کے ساتھ ہماری جانیں بچائیں اِس کے لیے یہ گاؤں ساری زندگی اِن کا احسان مند

رہے گا۔ مکھیوں نے وحشیوں کی ایسی خبر لی ہے کہ وہ برسوں تک یاد رکھیں گے اور اِدھر کا رُخ نہیں کریں گے۔ دونوں بہادروں کو گاؤں والوں کا سلام۔"

چِروا بول اُٹھا۔ "مگر سردار، دراصل یہ کارنامہ 'میٹھے لڑاکوں' (شہد کی مکھیوں) نے انجام دیا ہے۔"

اور گاؤں والوں کے قہقہے گونج اُٹھے۔

جادُوگر کی غلَطی

م ندیم (علیگ)

سارے قصبے میں یہ بات جلد ہی پھیل گئی کہ بدھو کمہار کا بیٹا راجو جو دس سال پہلے لاپتا ہو گیا تھا، واپس آ گیا ہے۔ یہ دس سال اُس نے بنگال میں گزارے اور وہ وہاں سے بنگال کا جادُو سیکھ کر آیا ہے۔ اُس کا نام اب ماسٹر راجو جادُوگر ہے۔ اب وہ بچّہ نہیں تھا، بلکہ ۲۵، ۲۶ سال کا لمبا تڑنگا

جوان تھا اور سفید دھوتی اور کُرتا پہنا کرتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت بانسری تھی جس کو سُن کر لوگ جھوم اُٹھتے تھے۔

ماسٹر راجو کے بارے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ وہ بہت بڑا جادُوگر ہے۔ وہ کسی بھی آدمی کو گدھا، گھوڑا، لوٹا یا ڈنڈا بنا دیتا ہے اور اُس کے پاس جو بانسری ہے اُس میں سارا کمال ہے۔ جس پر وہ بانسری گھُما دیتا ہے اُس پر جادُو کا اثر ہو جاتا ہے۔

قصبے کے لوگ اس سے بہت مرعوب تھے۔ چند لوگ ایسے تھے جنھوں نے اُس کے جادُو کے کمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ باقی وہ تھے جنھوں نے دیکھنے والوں کے بیان کو سچ سمجھ لیا تھا۔ شروع شروع میں شہرت کے لیے ماسٹر راجو نے مُفت میں اپنے جادُو کے کرتب دِکھائے، اور جب اُس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تو اُس نے جادُو دیکھنے کا

ٹکٹ لگا دیا۔ وہ مُنہ سے لوہے کے بڑے بڑے گولے اور کبوتر نکال کر دکھاتا۔ کسی لڑکے یا آدمی کی آنکھوں پر پٹّی باندھ کر منتر پڑھ دیتا اور وہ لڑکا یا آدمی لوگوں کی جیبوں میں رکھے ہوئے نوٹوں سے ہر قسم کی صحیح تعداد، اُن کا نام، گھڑی کا نمبر وغیرہ صحیح صحیح بتا دیتا۔ یہی نہیں وہ منتر پڑھ کر کسی آدمی کو چند منٹ کے لیے بے جان کر کے اُسے زمین پر لٹا دیتا۔ وہ دو چار فیٹ اُونچا اُٹھ جاتا۔ قصبے کے لوگوں کے لیے یہ سب باتیں بہت ہی حیرت ناک تھیں۔ وہ ماسٹر راجو سے ڈرتے بھی تھے اور اُس کی عزّت بھی کرتے تھے۔ مُکھیا صاحب جو کئی مقدموں میں پھنسے ہوئے تھے، دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے ماسٹر راجو کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ کُچھ لوگ گڑی ہوئی دولت کا پتا لگانے کے لیے اُس کی مدد چاہتے تھے۔ کُچھ کا خیال تھا کہ ماسٹر راجو جادُو کے زور سے یہ بھی بتا سکتا ہے۔ عرض ماسٹر

راجو جادُوگر کے چاروں طرف ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا تھا جو ہر طرح سے اِس کی خدمت کے لیے تیّار رہتے تھے اور اِس کی مدد کرتے تھے۔ ماسٹر راجو بہت چالاک انسان تھا۔ وہ سب کو بے وقوف بناتا تھا اور اِن کو جادُو سکھانے کا دِلاسا دیتا رہتا تھا۔ اِس نے انہیں یہ بتایا تھا کہ اِس کے قبضے میں جِن اور بھُوت پریت ہیں اور وہ اِن سے ہر کام لے سکتا ہے۔

دیال پور میں ہر سال جنوری کے مہینے میں ایک بڑا میلا لگتا تھا جو دو ہفتے تک چلتا تھا۔ دُور دُور سے لوگ چل کر میلے میں آتے تھے۔ شہر سے ایک سینما اور سرکس بھی آتا تھا۔ غرض خوب چہل پہل رہتی تھی۔ راجہ ماسٹر نے اِس میلے میں جگہ حاصل کرلی اور تماشا دِکھانے کا اعلان کر دیا۔ اس میلے میں ایک اور جادُوگر بھی، وہ بھی راجو کی طرح کے کرتب دِکھایا کرتا تھا۔ ماسٹر راجو نے اعلان کیا کہ وہ جادُو کے زور سے شیر بن سکتا ہے اور پھر

انسان کی شکل میں آ سکتا ہے۔ اس اعلان کی بڑی شہرت کی گئی۔ کئی ہزار روپے کے ٹکٹ فروخت ہو گئے۔ راجو ماسٹر نے یہ اعلان تو کر دیا لیکن وہ اپنے اُستاد کی نصیحت بھول گیا۔ اُس کے اُستاد نے نصیحت کی تھی کہ یہ جادُو کسی کو دِکھانے کے لیے نہیں بلکہ صرف خطرے کے وقت اپنی جان بچانے کے لیے کرنا۔ دراصل راجو ماسٹر دولت کما کر امیر بن جانا چاہتا تھا، اِس لیے اُس نے اپنے اُستاد کی نصیحت پر دھیان نہیں دیا۔

تحصیل دار صاحب کی سفارش سے اُسے یہ جادُو دِکھانے کی اجازت مل گئی۔ ایک بڑے میدان میں ماسٹر راجو کے لیے جادُو دِکھانے کا خاص اِنتظام کیا گیا۔ سارا میدان تماشائیوں سے بھر گیا۔ ماسٹر راجو میدان میں آیا۔ ابتدا میں اُس نے چھوٹے موٹے جادُو دِکھائے۔ مُنہ سے لوہے کے گولے نکالے، چمگادڑ اور کبوتر نکالے۔

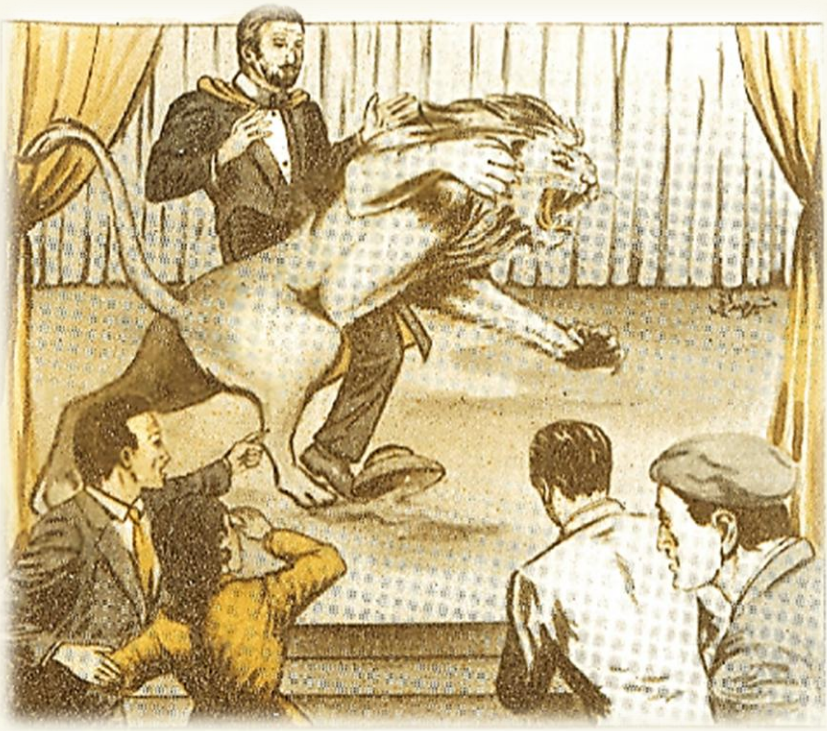

خالی جیبوں سے خرگوش اور لومڑی نکالی۔ وہ کئی گھڑے پانی پی گیا اور پھر مُنہ سے پانی کو نکال بھی دیا۔ ایک آدمی کو زمین سے تین فیٹ اُونچا اُڑا دیا۔ آسمان کی طرف رسّی پھینکی اور اُس پر چڑھ گیا۔ یہ سب جادُو وہ پہلے بھی دِکھاتا رہا تھا۔ اِس لیے لوگ اصل میں راجو ماسٹر کے شیر بن جانے والا

تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اُن کے بار بار شور مچانے پر اُس نے اعلان کیا:

"اب میں آپ کو شیر بن کر دِکھاؤں گا۔ یہ بنگال کا اصل جادُو ہے، جو آپ نے اب تک نہیں دیکھا ہوگا، آپ لوگ ڈریں نہیں سکون سے رہیں۔"

پھر اُس نے ایک پیالے میں پانی بھرا۔ اُس پر کُچھ پڑھ کر پھُونکا اور اپنے ایک ساتھی کو دیا اور کہا:

"جب میں شیر بن جاؤں گا تو میرا ساتھی یہ پانی مُجھ پر چھِڑک دے گا اور میں انسان کی شکل میں آجاؤں گا۔"

لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ ماسٹر راجو نے کالی چادر اوڑھ لی اور چند مِنٹ بعد چادر کے اندر سے ایک شیر باہر آگیا۔ بالکل اصلی شیر۔

اُس نے ایک زوردار دھاڑ ماری، سارا میدان لرزنے لگا۔ عورتیں، بچّے، بُوڑھے، جوان، جس کا جِدھر مُنہ اُٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔

اِسی بھگدڑ میں پیالے میں رکھا ہوا پانی بھی زمین پر گر پڑا۔ شیر تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا جیسے وہ اپنے اوپر پانی چھڑکنے کا مُنتظر ہو۔ مگر اُس کا ساتھی بھی گھبرا گیا تھا۔ وہ خوف کے مارے کانپنے لگا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ شیر میلے میں گھومتا رہا۔ وہاں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ دہشت سے لوگ میلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ شیر غُصّے سے پاگل ہو گیا۔ وہ بار بار دھاڑ رہا تھا مگر کوئی اُس کی مدد کو نہ آیا۔ وہ قریب کے جنگل میں چلا گیا۔

یہ اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اب بھی وہاں دیال پور میں جب میلا لگتا ہے تو لوگ ماسٹر راجو جادُوگر کے شیر بن کر جنگل میں چلے جانے کا قصّہ دہراتے ہیں۔

پاؤں کے نشان

معراج

مُراد پاشا کے سب ملازم باورچی خانے میں آتش دان کے پاس بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے، گپ شپ کے ساتھ ساتھ قہوے کا دَور بھی چل رہا تھا۔

مالی ایک لکڑی کو آگ میں جھونک کر بولا۔ "اوہو، کیسی سرد رات ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ آج رات بھر برف باری ہوگی۔"

باورچی بولا۔ "ایسی شدید سردی تو پہلے کبھی نہیں پڑی۔"

مُراد پاشا کا خاص خادم بولا۔ "اللہ کا شُکر ہے کہ اِس شدید سردی میں مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔ برف باری کے تصوّر سے ہی مُجھے تو تھرتھری آتی ہے۔ ذرا ایک پیالی قہوہ دینا۔" یہ کہ کر خادم نے اپنی کرسی آتش دان کے اور قریب کِھسکا لی۔ باورچی نے پیالی کو قہوے سے بھر دیا اور خادم کو دے دی۔ خادم چُسکیاں لے لے کر قہوہ پینے لگا۔ اُدھر باورچی اپنے بچپن کی باتیں سُنانے لگا۔ خادم بہت توجّہ سے اُس کی دِل چسپ باتیں سُنتا رہا۔ گرمی کے اثر سے اُس کے رُخسار تمتمانے لگے اور وہ اونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نیند کے آغوش میں پہنچ گیا۔ اُسے کُچھ بھی خبر نہیں رہی کہ باورچی کیا کہہ رہا ہے۔

کسی نے چیخ کر کہا۔ "اُٹھو اٹھو جلدی کرو۔"

خادم نے جلدی جلدی اپنی آنکھیں ملیں اور انگڑائی لے کر بولا۔

"شاید میں سو گیا تھا۔ ہاں کیا بات ہے؟"

مالی نے بتایا۔ "مُراد پاشا نے تمہیں یاد فرمایا ہے۔ اب جلدی کرو، انہیں زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت مت دو۔"

خادم کو یہ بے وقت کی مداخلت بہت بڑی معلوم ہوئی۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ "اوہ میرے اللہ ایک نوکر کی زندگی بھی کیسی بے لُطف اور بے کار زندگی ہے۔ نہ سونا اپنے اختیار میں اور نہ جاگنا۔ ایسی مزے کی نیند آ رہی تھی مگر مالک نے بُلا بھیجا ہے۔"

اُس نے جلدی جلدی اپنے بالوں کو ٹھیک کیا اور مُراد پاشا کے خاص

کمرے کی طرف دوڑا۔ مراد پاشا کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور برف باری کا نظّارہ کر رہا تھا۔ خادم کے قدموں کی چاپ سُن کر وہ مڑا اور بولا۔ "تُم یہاں میرے قریب آجاؤ۔"

خادم بھی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ تھوڑی سی دیر میں سڑکوں پر ڈھیروں برف جمع ہو گئی تھی۔ شاہ بلوط کے درخت برف سے سفید ہو رہے تھے۔ اِتنے میں چاند بھی نکل آیا۔ اُس کی مدہم روشنی میں باہر کے منظر کی دِلفریبی اور بھی بڑھ گئی تھی۔

خادم نے کہا، "عالی جاہ! باہر کا منظر بہت ہی خوب صورت ہے۔ آج تو غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔ ہمارے مالی کا خیال ہے کہ برف باری رات بھر جاری رہے گی۔"

پاشا نے کہا۔ "باہر کا نظّارہ واقعی بے حد دِلفریب ہے لیکن میں نے تمہیں

کسی اور وجہ سے یہاں بلایا ہے۔"

یہ کہہ کر پاشا کُچھ دیر تک خاموش رہا، پھر بولا۔ "آج شام کے وقت ایک بُوڑھا شخص سامنے کے درختوں سے لکڑیاں چُنتا پھر رہا تھا۔"

خادم نے ادب سے کہا۔ "جی سرکار، میں نے بھی اُسے دیکھا ہے۔ وہ اکثر یہاں لکڑیاں چُننے کے لیے آتا رہتا ہے۔"

پاشا نے پوچھا۔ "کیا تمہیں اِس غریب بُوڑھے کا گھر معلوم ہے؟"

خادم بولا۔ "حضور، وہ بُوڑھا یہاں سے بہت دُور ایک پہاڑی کے پاس جھونپڑی میں رہتا ہے۔ کُچھ دِن پہلے میں اس کے گھر کے پاس سے گزرا تھا۔ جھونپڑی بہت ہی خراب اور ٹوٹی پھوٹی ہوئی تھی۔ بُوڑھا پہلے تو لکڑیاں بازار میں فروخت کر کے اپنی روزی کما لیتا تھا، لیکن برف باری کے

موسم میں وہ بے کار رہتا ہے اور اُس کی گُزر بسر بہت تنگی اور دشواری سے ہوتی ہے۔"

مُراد پاشا بہت دیر تک کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ خادم اِس تذبذب میں تھا کہ وہاں کھڑا رہے یا چلا جائے۔ آخر کُچھ دیر بعد اُس نے پوچھا، "میرے لیے اب کیا حُکم ہے سرکار؟"

پاشا نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تُم اور میں اِس عالی شان محل میں رہتے ہیں، جہاں کمرے گرم کرنے کے لیے آتش دانوں میں آگ جل رہی ہے۔ ہمارے پاس موٹے موٹے اونی کمبل اور لحاف ہیں، پینے کے لیے گرما گرم قہوہ اور یخنی ہے۔ زندگی کی ہر آسائش ہمیں میسّر ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ سردی کیسی ہوتی ہے اور بھُوک کیا ہے؟"

خادم ادب سے بولا۔ "آپ نے بجا فرمایا سرکار۔"

پاشا نے کہا۔ "کبھی تُم نے اِن لوگوں کے متعلّق بھی سوچا ہے جو غریب ہیں اور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ سرد ہوا اِن کی جھونپڑیوں میں گھُس جاتی ہے۔ اِن غریبوں کے پاس آگ جلانے کے لیے نہ تو لکڑیاں ہیں اور نہ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی۔"

خادم بولا۔ "جی سرکار مُجھے کبھی کبھی ایسے لوگوں کا خیال آتا ہے۔"

پاشا نے کہا۔ "وہ بُوڑھا آدمی جیسے ہم نے دیکھا، اللہ جانے اُس نے کُچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں؟ اب تُم جاؤ اور کُچھ لکڑیاں اور کھانے پینے کا سامان لاؤ۔ آج رات ہم اس غریب آدمی کے گھر جائیں گے۔"

جب خادم چلنے لگا تو پاشا نے تاکید کی۔ "باورچی سے کہنا کہ وہ کھانے پینے کی چیزیں ایک تھیلے میں باندھ دے۔"

خادم نے کہا۔ "جی بہتر ہے۔"

وہ پاشا کے اِس بے وقت حُکم پر بہت ناخوش تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس شدید سردی میں وہ ساری رات آگ کے پاس گزارے۔

پاشا کے حُکم کے مطابق باورچی نے کھانے کی چیزیں ایک تھیلے میں باندھ دیں۔ پاشا نے اِن چیزوں کا تھیلا اُٹھا لیا، خادم نے لکڑیوں کا گٹھا اور مشعل اُٹھا لی۔ وہ تاریک رات میں چل کھڑے ہوئے۔ وہ برف کے اُونچے اُونچے ڈھیروں کے پاس سے گُزرے۔ برف کے گالے ابھی تک ہوا میں اُڑتے پھر رہے تھے۔ برف اور زیادہ تیزی سے گِرنے لگی۔ اِس کے ساتھ ساتھ ہوا کا شور بھی بڑھتا چلا گیا۔ ایک بدلی نے چاند کو ڈھانپ لیا۔ وہ مشعل کی مدھم روشنی میں چلتے رہے۔

پاشا نے کہا۔ "ہم جلد ہی وہاں جا پہنچیں گے۔"

خادم اِس بات پر مُسکرایا لیکن وہ دِل میں بے حد اُداس اور رنجیدہ تھا۔ برف کے گالے اُس کے مُنہ اور ہاتھوں پر سوئیوں کی طرح چُبھ رہے تھے۔ لکڑیوں کا گٹھا بار بار اُس کے ہاتھوں سے پھسل رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ اتنے سرد ہو گئے کہ اُس کے لیے اب مشعل کو اُٹھانا بھی مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے پاؤں تو برف میں جمے جا رہے تھے۔

پاشا خوش دِلی سے بولا۔ "ذرا سوچو تو سہی کہ یہ سب چیزیں پا کر کتنا خوش ہو گا۔ اُس نے اپنی زندگی میں ایسے کھانے کبھی چکھّے بھی نہ ہوں گے اور آج رات اُس کی جھونپڑی میں اِن لکڑیوں کی آگ سے کیسی گرمی رہے گی۔"

اُدھر خادم کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ آخر جب اُس کی ہمّت جواب دے گئی تو وہ بولا۔ "سرکار اب مُجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جا رہا ہے۔" پاشا ٹھیر گیا۔ اُس نے خادم کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور اُس کی روشنی میں خادم کا

چہرہ دیکھا۔ وہ ڈھلے ہوئے لٹھّے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ پاشا افسوس سے بولا۔ "میں نے ایک غریب آدمی کو راحت پہنچانے کے لیے تمہیں خواہ مخواہ تکلیف میں ڈالا۔ بیٹا، مُجھے بے حد افسوس ہے۔ یہ لکڑیوں کا گٹھا میرے سر پر رکھ دو۔ یہ مشعل بھی مُجھے دے دو۔ تُم چادر اچھی طرح لپیٹ لو اور میرے پیچھے پیچھے چلو۔ مُجھے اُمّید ہے کہ تُم اب سردی محسوس نہ کرو گے۔"

خادم مُسکرا کر بولا۔ "ٹھیک ہے سرکار۔"

پاشا نے ہمّت بڑھاتے ہوئے کہا۔ "حوصلہ رکھو

میرے بچّے۔"

خادم مُراد پاشا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ اب تیز ہوا اور برف کے گالوں سے بچ گیا تھا۔ جہاں مُراد پاشا قدم رکھتا وہاں ایک گڑھا سا بن جاتا۔ خادم قدموں کے نشانات پر قدم رکھتا ہوا چلتا رہا۔ اُسے یہ ایک دِل چسپ کھیل محسوس ہو رہا تھا۔ اب وہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا جسم بھی گرم ہونے لگا۔ اُسے یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ پاشا کے قدموں کے نشانات گرم محسوس ہو رہے تھے۔

پاشا نے پوچھا۔ "بیٹا، اب تُم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

خادم بولا۔ "سرکار، مُجھے اب سردی بالکل محسوس نہیں ہو رہی ہے اور آپ کے قدموں کے نشان بہت گرم ہیں۔ جب میں انِ نشانوں پر پاؤں رکھتا ہوں تو گرمی محسوس کرتا ہوں۔"

پاشا ہنس کر بولا۔ "بیٹا تُم بہت نیک دِل لڑکے ہو۔"

خادم کا دِل خُوشی سے جھُوم اُٹھا۔ ذرا سی تعریف کر دینے سے دوسروں کا حوصلہ بُلند ہو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ جھونپڑی کے پاس جا پہنچے۔ خادم نے دروازے پر دستک دی۔ بُوڑھے نے دروازہ کھولا۔ وہ مُراد پاشا کو اپنے دروازے پر دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ اس کے مُنہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ ہکلا کر بولا۔ "آپ؟ عالی جاہ سُلطان مُراد پاشا؟"

پاشا مُسکرا کر بولا۔ "ارے ہاں بھئی یہ میں ہی ہوں۔ میں تمہاری خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔ تُم ذرا اپنی بیٹی کو جگاؤ تاکہ وہ کھانا گرم کرے اور ہمارے لیے قہوہ بنا کر لائے۔"

بُوڑھے نے جلدی سے اپنی بیٹی کو جگایا۔ ہوا کے جھونکے جھونپڑی میں آ رہے تھے۔ دو بچّے ایک پھٹی ہوئی رضائی میں ٹھٹھرے ہوئے پڑے تھے۔ وہ بھی جاگ گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ گھر کے سب لوگ بھُوکے تھے۔ بُوڑھے کی بیٹی نے جلدی جلدی کھانا گرم کیا۔ سب لوگ دستر خوان پر کھانے کے لیے بیٹھے، خادم نے پہلا لُقمہ مُنہ میں ڈالا تو خُوشی سے پُکار اُٹھا:

"اللہ کی قسم میں نے آج تک ایسا لذیذ کھانا کبھی نہیں کھایا۔" پاشا بولا۔ "میرے نیک دِل خادم، تُم سچ کہتے ہو۔"

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ صُبح کا وقت ہو چلا تھا۔ مراد پاشا نے اپنی جیب سے ایک تھیلی نکالی اور بُوڑھے سے بولا۔ "تُم اپنی ضرورت کی چیزیں اور دوسرا سامان لے آنا۔ جب یہ رقم ختم ہو جائے تو مُجھے اِطّلاع کر

دینا۔"

راستے میں مُراد پاشا نے ایک دفعہ پھر کہا۔ "بڈیا، مُجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں تکلیف دی۔"

خادم بولا۔ "عالی جاہ! آپ مُجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ آج مُجھے جو خُوشی حاصل ہوئی ہے وہ قارون کی دولت مل جانے پر بھی نہ ہوتی۔"

پاشا نے کہا۔ "بے شک انسانوں کی خدمت کرنے سے سچّی خُوشی حاصل ہوتی ہے۔"

خادم نے پوچھا۔ "عالی جاہ! میں اب تک یہ راز سمجھ نہیں پایا کہ آپ کے قدموں کے نشان کیوں گرم تھے؟"

مُراد پاشا مُسکرایا۔ "میرے بچّے میرے قدموں کے نشان گرم نہیں تھے

اور نہ میرے پیچھے پیچھے چلنے سے تمہارا جسم گرم ہوا۔ جب کوئی شخص کسی کام کو بے دِلی اور بے زاری سے کرتا ہے تو وہ تھک جاتا ہے، لیکن جب کوئی شخص کسی کام کو دِل چسپی سے کرتا ہے تو اُسے نہ تھکن کا احساس ہوتا ہے اور نہ سردی کا۔ بیٹا، یہ تمہارا عزم اور ہمّت تھی جس نے تمھارے جسم میں گرمی کی لہر دوڑادی تھی۔"

مچھلی والا

محمد عمران

مچھلی والے نے جو بھی اپنی سائیکل محلے کی طرف موڑی، نُکّڑ پر بیٹھے ہوئے کُتّے نے اپنی زبان لٹکا دی اور مچھلی والے کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔ اِس خیال سے کہ جب مچھلی والا کسی گھر میں مچھلی بنا کر دے گا تو کُچھ نہ کُچھ حصّہ اُس کو مل ہی جائے گا۔

"تازہ مچھلی۔" مچھلی والا برابر آواز لگاتا رہا، لیکن اِس محلّے والوں کا جیسے آج مچھلی پکانے کا ناغہ تھا۔ کسی نے اُس کی طرف توجّہ نہ کی، یہاں تک کہ مچھلی والا محلّے کے دوسرے کونے پر پہنچ گیا۔ اچانک ایک گھر کا پھاٹک کھلا۔ بچّے اسکول جانے کے لیے تیّار کھڑے تھے۔ مچھلی والے کو دیکھتے ہی اُنھوں نے مچھلی کھانے کا مطالبہ کر دیا۔ اُن کے ابّو نے مچھلی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ "یہ تو باسی ہے، پھر کبھی سہی۔"

مچھلی کی بُو کُتّے کی بھُوک کو بھڑکا رہی تھی۔ وہ اپنے مُنہ سے گِرتی ہوئی رال کو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ مچھلی والا بڑبڑا رہا تھا۔، "لوگ تازہ چیز کو بھی باسی بنا دیتے ہیں۔ یہ صرف نہ لینے کے بہانے ہیں، حال آں کہ میں ابھی دوسرے محلّے میں کئی گھروں کو دے کر آیا ہوں۔ کسی نے بھی میری مچھلی کو باسی نہیں بتایا۔" اِسی طرح بڑبڑاتا ہوا دوسرے محلّے میں

داخل ہو گیا۔ کُتّے کے پاؤں وزنی ہوتے جا رہے تھے۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں صبر کرتا تو اچھّا رہتا۔ کم سے کم اِس کے پیچھے ٹانگیں نہ تڑواتا۔ شاید وہیں کُچھ کھانے کو مل جاتا۔ وہ مایوس ہو کر پلٹنے ہی لگا تھا۔ بے چارہ تھک گیا ہے، ضرور وہی کُتّا لگتا ہے جو موڑ سے میرے پیچھے لگا تھا۔ بے چارہ تھک گیا ہے۔ ضرور اِسے بہت زیادہ بھوک لگی ہو گی ورنہ یہ اتنی دور تک میرے پیچھے نہ آتا۔

مچھلی والے کو اپنی بھوک یاد آ گئی اور وہ بے چین ہو گیا۔ اُس نے ایک منٹ سوچا پھر ایک بڑی سے مچھلی نکالی اور اُس کے ٹکڑے کر کے کُتّے کے آگے ڈھیر کر دیے۔ کُتّا جلدی جلدی اُن کو نگلنے لگا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مچھلی والے کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ مچھلی والا خوشی سے پھُولا نہ سما رہا تھا جیسے اُس نے آج بہت ہی زیادہ نفع کمایا ہو، کئی گنا زیادہ نفع۔

دو چور

نازیہ فیض احمد بلوچ

فضلو ایک چور تھا۔ کوئی ایسا پیشہ ور چور بھی نہیں کہ راتوں کو گھر ویران کر کے چلتا ہے، ہاں البتہ چلتے پھرتے چھوٹی موٹی چیزوں پر ہاتھ صاف کر لینا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ فضلو کو گندم کی بوریاں دوسرے گاؤں لے کر جانا تھیں جو اس کے گاؤں فیروز پور سے تقریباً

دس میل کے فاصلے پر تھا۔

یوں تو فضلو چاہتا تو کرائے پر بیل گاڑی لے کر آرام سے گندم کی بوریاں لے جا سکتا تھا، مگر بھئی وہ چور ہی کیا جو چھوٹی موٹی ضرورتوں کو پیسے دے کر پورا کرے۔ جس گاؤں اُسے گندم کی بوریاں پہنچائی تھیں اس گاؤں کا نام فراز گڑھ تھا۔ اتوار کو اُسے سفر شروع کرنا تھا۔ ہفتے کی رات جب فضلو کھیتوں میں قلانچیں بھرتا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں اُسے کرمو کا گدھا نظر آیا، فضلو کو یاد آیا کہ صُبح سے کرمو دھوبی اپنے گدھے کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ "چل بے گدھے تُجھے تیرے مالک کے پاس لے چلوں۔" فضلو نے گدھے کے اِرد گرد سے کانٹے ہٹاتے ہوئے کہا۔

دراصل گدھا جھاڑیوں اور کانٹوں میں اِس بُری طرح پھنسا تھا کہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ فضلو نے جھاڑیاں صاف کر کے اُس کے لیے راستہ بنایا اور

اس کا کان پکڑ کر اُسے گھسیٹتا ہوا لے کر کر مو کے گھر کی طرف چلا۔ گدھا بھی اَڑیَل تھا، ہِل کر نہیں دیتا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ آگے بڑھا تو فضلو نے ایک چھڑی اُٹھائی اور اُچک کر گدھے پر سوار ہو گیا۔ ٹک، ٹک، ملک چل میرے گدھے، چل رے چل!" فضلو مزے سے گُنگُناتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

اچانک اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ میں گندم کی بوریاں اِس گدھے پر لاد کر فراز گڑھ جاؤں۔ لیکن فوراً ہی اُسے کرمو دھوبی کا خیال آیا۔ وہ بڑا کنجوس تھا۔ مجال ہے جو مانگے سے کسی کو کوئی چیز دے دے۔ "نہیں نہیں میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں کرمو کو بتائے بغیر یہ گدھا فراز گڑھ لے جاؤں گا۔" فضلو نے خود سے کیا، مگر پھر سوچا مگر بعد میں جب یہ گدھا میں واپس لاؤں گا تو کرمو کو کیا جواب دوں گا؟ وہ میری شکایت پنچائیت میں کرے گا اور مُجھے سخت سزا ملے گی۔

آخر وہ کشمکش میں بُتلا گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ پھر شیطان اس کے ضمیر پر غالب آ ہی گیا۔ وہ بڑے مزے سے گدھے کو اپنے گھر میں لے گیا اور ایک کونے میں باندھ دیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ گاؤں کے لوگ جلد ہی اپنے اپنے گھروں کو چل دیے تھے اور کچی گلیوں میں محفلیں نہیں لگی

تھیں، ورنہ کرمو کا گُم شدہ گدھا فضلو کے پاس دیکھ کر طرح طرح کی باتیں بنتیں۔

فضلو نے رات کو دیر تک جاگ کر فیصلہ کیا کہ وہ صُبح ہی صُبح گدھے پر بوریاں لاد کر ایسے راستوں سے نکلے گا کہ کوئی دیکھ نہ سکے اور فراز گڑھ پہنچ کر گدھا بیچ دے گا۔ اِس کے بدلے کوئی دوسرا گدھا لے کر گاؤں واپس آئے گا۔ پوری اسکیم سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

گاؤں والے صُبح عموماً پانچ بجے تک اٹھتے تھے۔ مسجد میں امام صاحب کے پیچھے باجماعت نماز ہوتی اور کسان اپنے اپنے ہل اور کھرپیاں لیے کھیتوں کو روانہ ہوتے۔

فضلو چار بجے ہی اُٹھ گیا۔ نہا دھو کر تیّار ہوا اور پھر گدھے کو چارا ڈالا۔ تقریباً ساڑھے چار بجے کے قریب وہ گھر سے نکلا اور پانچ بجے وہ گاؤں کی

سرحدوں کو الوداع کہہ رہا تھا۔

فضلو کو ہم تھوڑی دیر کے لیے راستے میں چھوڑ کر اس سے پہلے فراز گڑھ چلتے ہیں۔ فراز گڑھ بہت اچھّا گاؤں تھا۔ یہاں کے لوگ شریف، ایمان دار، محنتی اور مخلص تھے۔ مگر یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جہاں پانچ اچھّے ہوں وہاں ایک بُرا بھی ہوتا ہے۔ فراز گڑھ میں بھی ایک چور تھا۔ بالکل ایسا ہی چور جیسا فضلو تھا۔ بس نام کا فرق تھا۔ اس چور کا نام تھا ہانو۔

ہاں تو بانو آج کل بڑا پریشان تھا۔ وہ اس لیے کہ اسے چند پیاز کی ٹوکریاں فیروز پور پہنچانی تھیں۔ مگر فضلو کی طرح اس کا مسئلہ بھی یہ تھا اس کے پاس کوئی سواری کا انتظام نہ تھا۔

خیر ہفتے کی رات کو اُس نے سوچا کہ گاؤں کی سرحد تک تو وہ پیاز کی ٹوکریاں سر پر رکھ کر لے جائے گا اور پھر پکّی سڑک سے کوئی بس پکڑ کر اس میں سفر

کرے گا۔ مگر اتوار کی صُبح تو اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ ہوا یوں کہ جب وہ پیاز کی ٹوکریاں سر پر لاد کر لڑکھڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اس کی نظر دینو چاچا کی بیل گاڑی پر پڑی۔ بانو جیسے لوگ تو موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ پیاز کی ٹوکریاں گاڑی میں رکھ، اُچھل کر گاڑی میں سوار ہوا اور ہل ہل کی آوازیں نکالتا یہ جا وہ جا۔ اِدھر دینو چاچا کھیتوں سے نکل کر جو پگڈنڈی پر آئے تو اپنی بیل گاڑی غائب پائی۔ غریب "ہائے" کی آواز نکال کر ڈھونڈنے بھاگے۔ اب فضلو کے کُچھ احوال معلوم کریں :

فضلو دِن بھر سفر کر کے بہت تھک چکا تھا۔ اب وہ کُچھ آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی دِلی مُراد بَر آئی۔ سامنے ہی ایک چھوٹی سی سرائے پر اس کی نگاہ پڑی۔ اس نے جھٹ گدھے کو باہر درخت سے باندھا اور اندر داخل ہوا : "کیوں بھائی، کیا پکایا ہے؟" اس نے ٹھنڈے پانی سے بھرے برتن کو

اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"بابو، نہایت مزے دار اَرہَر کی دال، املی کی چٹنی اور روٹی ہے۔" سرائے میں بنچ پر بیٹھے لڑکے نے پہلے دانتوں کی نمائش کی۔

"تو پھر انتظار کس بات کا ہے، لے آ جلدی سے۔" فضلو مُسکرا کر بولا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فضلو ایک چارپائی پر لیٹا خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد سرائے میں تھکا ماندہ ایک اور شخص داخل ہوا۔

"بھائی یہاں سے فیروز پور کتنے فاصلے پر ہے؟" اُس نے پوچھا۔ یہ ہانو تھا۔

"فیروز پور تو یہاں سے ۵ میل دور ہے۔" لڑکے نے جواب دیا، جو غالباً سرائے کا منتظم تھا۔

ہانو بھی کھانا کھا کر فضلو کے برابر والی چارپائی پر لیٹ گیا۔

پہلے فضلو جاگا۔ اُس نے دیکھا کہ سورج ڈھلنے والا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھا۔ سرائے کا کرایہ ادا کیا اور مزے سے گُنگُناتا باہر نکلا۔

"کیا شان دار ہیل ہے!" اُس نے ہانو کے بیل کی گردن سہلائی۔ پھر اُس نے اپنے گدھے کی جانب دیکھا جو چُپ چاپ گردن جھُکائے بتّے کھانے میں مصروف تھا۔ "چل بے گدھے یہاں ختم ہوا اپنا ساتھ۔" اُس نے گدھے کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔ مزے سے بیل کو گاڑی میں جوتا جیسے اس کا اپنا ذاتی بیل ہو۔ اِس کے بعد اپنی گندم کی بوریاں گاڑی میں رکھیں اور پیاز کی ٹوکریاں گدھے کی کمر پر لاد دیں۔ بیل گاڑی میں سوار ہوا اور تیزی سے فراز گڑھ روانہ ہوا۔ فضلو راستے میں اتنا خوش تھا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

اُس کا خیال تھا کہ وہ رات تک فراز گڑھ پہنچ جائے گا۔ ایک رات وہاں

گزار کر صبح اپنی بیل گاڑی لے کر فیروز پور لوٹ جائے گا۔

اِدھر سرائے میں ہانو ایک جماہی لے کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر مُنہ ہاتھ دھویا اور مزے سے باہر نکلا: "ایں! بیل گاڑی کہاں چلی گئی؟" وہ حیران و پریشان کھڑا تھا۔

"اے بھائی! میری بیل گاڑی دیکھی ہے؟ ایک سفید اور ایک بھورا بیل تھا۔" اُس نے پاس سے گزرنے والے آدمی کو مُخاطب کیا۔

"ارے بھائی، اس جگہ چور اُچکّوں کی کمی نہیں اور اِس سرائے میں تو کوئی دوسرے کے کام میں دخل اندازی بھی نہیں کرتا، لے اڑا ہو گا کوئی تمہاری بیل گاڑی۔" اس آدمی نے اُسے سمجھایا۔

بے چارہ چور، ہانو سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا: "میں بھی کسی

دوسرے کی سواری کیوں نہ لے اُڑوں۔ "پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ فضلو کا گدھا مزے سے ہتّے چبا رہا تھا۔ اُس کے پاس پیاز کی بوریاں دیکھ کر ہانو کا ماتھا ٹھنکا۔

اور چند لمحوں کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ پیاز کی بوریاں اسی کی تھیں، واہ بھئی واہ۔ چور بھی شریف تھا، سواری کا بندوبست کر گیا۔ "ہا تو خوش ہو کر بولا۔ اور پھر وہ فضلو کے گدھے پر سوار فیوز پور جا رہا تھا۔ سچ ہے گیڈر کی شامت آئے تو شہر کا رُخ کرتا ہے۔

اِدھر فضلو خوش خوش فراز گڑھ میں داخل ہوا۔ دھر، دھر، دھڑ گاڑی کھڑکاتا بنیے کے گھر جا کر رُکا۔ اس نے ہانک لگائی۔ "ارے بھائی بنیے! یہ فیروز پور سے تیری گندم آئی ہے۔" بنیا صافے سے پسینہ صاف کرتا باہر نکلا۔ "ہاں بھائی! اُتار دے۔" بنیے نے فضلو کی مدد سے بوریاں اُتارنا شروع

کیں۔

بنیا چونکا : "ارے! یہ تو دینو چاچا کی بیل گاڑی ہے!" اُس نے دِل میں سوچا۔

"بھائی، بیل تو اچھّے ہیں! کیا تمہاری بیل گاڑی ہے؟" بنیے نے فضلو سے پھر پوچھا۔

"ظاہر ہے میرے ہی ہیں۔ چُرانے سے تو رہا میں۔" فضلو نے ناک چڑھا کر کہا۔

"اچھّا تو ناراض کیوں ہوتے ہو۔" بنیے نے خوشامدی لہجہ اختیار کیا۔ "تُم بیٹھو، میں چائے پانی کا بندوبست کروں۔" بنیے نے دروازے کے قریب بچھی چارپائی کی جانب اشارہ کیا۔

فضلو نے حیرت سے بنیے کو دیکھا اور کندھے اُچکا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد آہٹ سے اُس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا، بنیا، دو تین آدمیوں کے ساتھ اُس کے سر پر موجود تھا۔ یہ لوگ دینو چاچا اور اُس کے تین عدد جوان بیٹے تھے۔

"کیا بات ہے بھائی، کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟" اُن سب کے ہاتھوں میں لاٹھیاں دیکھ کر فضلو کا ماتھا ٹھنکا۔

"یہ گاڑی کس کی ہے بے؟" دینو چاچا کے بڑے بیٹے نے پوچھا۔

"م۔۔۔م۔ میری۔" فضلو ہکلایا۔

"اچھّا تیرے باپ کے بیل ہیں۔" دینو چاچا کے بڑے بیٹے نے اُس کا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیا، پھر لگا تار دو تین تھپّڑ رسید کیے۔ تھوڑی ہی مار کھا کر

فضلو نے سب کُچھ اُگل دیا۔ یہ بھی کہ وہ کرمو کا گدھا چُرا کر لایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کے بزرگوں نے فیصلہ سُنایا :

"فضلو چوں کہ ایک چور ثابت ہو چکا ہے۔ غریب لوگوں کے مال پر ہاتھ صاف کرتا ہے، لہٰذا اِسے سزا دی جاتی ہے کہ اِسے کالے گدھے پر بٹھا کر اِس کے مُنہ پر کالک مل کر اور گلے میں جوتوں کے ہار پہنا کر اِسے کل صُبح اِس کے گاؤں پہنچا دیا جائے گا۔"

فراز گڑھ کے لوگوں کو یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ دراصل سرائے تک دینو چاچا کی بیل گاڑی لے کر جانے والا ہاتو ہے، کیوں کہ پیاز کا کا بہانہ کرتا تھا۔ پورے گاؤں میں سے صرف وہی غائب تھا۔

"کرمو چاچا! کرمو چاچا! ایک آدمی پیاز لے کر فراز گڑھ سے آیا ہے۔ اس کے پاس تمہارا گدھا ہے جس پر تمہارا نام کرمُو لکھا ہے۔" گاؤں کے چند

بچّوں نے کرمو کو اِطّلاع دی۔ کرمو کام چھوڑ کر بھاگا۔

اور پھر ہانو کے ساتھ بھی فضلو والا حشر ہوا، کرمو نے مار مار کر اس سے سب کچھ اُگلوا لیا۔ ہانو بھی پہلے ماننے پر تیار نہ تھا کہ گدھا کرمو کا ہو سکتا ہے وہ اسے اپنی ملکیت ٹھیراتا تھا۔ چوں کہ گاؤں، گوٹھوں کے قوانین کُچھ ملتے جلتے ہیں لہٰذا، ہانو کو بھی فضلو والی سزا سُنائی گئی۔

اور پھر اُسی سرائے کے سامنے فضلو اور ہالو کا سامنا اس طرح ہوا کہ دونوں کالے گدھوں پر سوار جُوتے کھاتے، گلوں میں ٹوٹی چپلوں کے ہار پہنے سر جھُکائے اپنے اپنے گاؤں کی طرف روانہ تھے۔

گھوڑے نے پڑھی کتاب

اشرف نوشاہی

پرانے وقتوں کی بات ہے۔ ایک ہی قصبے کے رہنے والے دو آدمی قسمت آزمائی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ قصبے میں رہتے ہوئے ان کی حالت بڑی پتلی ہو گئی تھی۔ ایک سیانے سے پوچھا تو اس نے کہا: "سفر وسیلۂ ظفر ہے۔" دونوں نے بچا کھچا رُوپیہ لگا کر ایک ایک گھوڑا اور کُچھ

کھانے کا سامان خریدا۔ اس کے بعد جو پیسے بچے وہ سفر خرچ کے لیے ساتھ لیے اور کسی نئی منزل کو چل دیے۔ اکیلے ہی تو تھے رُخصت کرنے بھی کوئی نہ آیا۔

اِن دونوں کی پہلے تو واجبی سی شناسائی تھی لیکن اب سفر نے ایک دوسرے سے خوب واقف کر دیا۔ ان میں سے ایک کا نام شاکر اور دوسرے کا مطلبی تھا۔ شاکر کا خیال تھا کہ دنیا میں سچّی خُوشی اور کام یابی صرف ایمان داری سے حاصل ہوتی ہے۔ انسان کو دوسرے انسانوں کے کام آنا چاہیے۔ کسی قسم کی بھی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔ نیّت ثابت منزل آسان۔ شاکر ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا تھا۔ دوسرے کا نام مطلبی، اس کی طبیعت کے عین مطابق تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا میں ایمان داری سے کُچھ نہیں مل سکتا۔ آدمی کو مطلب کا یار ہونا چاہیے۔

دوسروں سے مطلب نکالنا چاہیے اور بس۔ اس کی نیّت کبھی بھرتی نہیں تھی اور ہر وقت اپنی قسمت کی شکایت کرتا رہتا تھا۔

دن گزرتے رہے اور یہ دونوں مسافر وادیوں، صحراؤں اور دریاؤں کو عُبُور کرتے آگے بڑھتے رہے۔ راستے میں ہر جگہ اُنھوں نے ایک مُلک کی بڑی تعریف سُنی، جس کا نام دولت نگر تھا لیکن یہ بھی سُنا کہ دولت نگر کا بادشاہ بڑا ظالم ہے۔ شاکر نے تو یہ سُن کر کہا کہ وہاں جانے کا ارادہ نہ کریں، لیکن مطلبی نہ مانا۔ ناچار شاکر بھی چلتا رہا کہ شاید راستے میں ہی اس کی باتیں مطلبی کی سمجھ میں آجائیں اور وہ اس بظاہر پُر کشش لیکن ظُلم کی نگری میں جانے سے باز آجائے۔

جب وہ دولت نگر کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اس کے اُونچے اونچے مینار دُور سے نظر آنے لگے تو مطلبی کی خُوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے

گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ جلدی سے صدر دروازے میں داخل ہو جائے جو اب چند فرلانگ پر تھا۔ اچانک اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ نیچے گر پڑا۔ اس کے ہاتھ مٹّی سے بھر گئے۔ شاکر گھوڑے سے اُتر کر اس کے پاس آیا اور اُسے اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ دو بڑے بڑے اور انتہائی خوب صورت ہیرے زمین پر نظر آئے۔ مطلبی نے جھپٹ کر ہیرے اُٹھا لیے اور چلّایا: "میرے ہیرے!"

شاکر نے جو اس کے پاس ہی کھڑا تھا کہا : "میرے نہیں ہمارے کہو۔"

مطلبی نے مُنہ بگاڑا۔ "ہُنھ ہمارے کہو! اچھّی طرح سُن لو۔ یہ صرف میرے ہیں، اور یہ بھی سُن لو کہ ہمارا ساتھ سفر تک تھا۔ اب تُم الگ، میں الگ۔"

شاکر حیران ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا : "میرے دوست، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کتنے دِن اور کتنی راتیں ہم نے سفر میں ساتھ گزاری ہیں۔ کتنا لمبا سفر ساتھ طے کیا ہے۔ اور اب ان حقیر ہیروں کے لیے تم مُجھے چھوڑ رہے ہو؟" "یہ تمھارے لیے حقیر ہوں گے میرے لیے نہیں۔" مطلبی اُٹھ کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔

شاکر اُس کے پیچھے لپکا : "لیکن سُنو تو سہی! تم مُجھے ہیرے نہ دو۔ میں تم سے کُچھ نہیں مانگتا، لیکن میرا ساتھ تو نہ چھوڑو۔ ساتھی اِن ہیروں کی طرح

راستے میں پڑے نہیں ملتے۔"

مطلبی نے اِس کے جواب میں شاکر کو زور کا دھکّا دیا۔ بے چارہ زمین پر گر پڑا اور اُس کی کہنیوں سے خون رِسنے لگا، لیکن اُس کے مُنہ سے یہی نکلا:
"اے اللہ! تیرا شُکر ہے۔"

یوں دونوں مسافر دولت نگر پہنچنے سے پہلے ہی الگ الگ ہو گئے۔ چوں کہ مطلبی آگے تھا وہ پہلے پہنچا، اور کُچھ دیر بعد شاکر صدر دروازے سے داخل ہو رہا تھا تو مطلبی قید خانے پہنچ چُکا تھا۔ دراصل وہ ہیرا بادشاہ کا تھا اور ایک ہفتے پہلے کھو گیا تھا۔ ہر طرف اس کی تلاش جاری تھی۔ جب مطلبی پہنچا تو اس کی بھی تلاشی ہوئی اور اس طرح اُسے ہیرے کا چور قرار دے کر قید خانے میں پھینک دیا گیا۔ قید خانے میں مطلبی بڑی تکلیف میں تھا۔ داروغہ بار بار پوچھتا تھا کہ چوری کا اور مال کہاں چھپا رکھا ہے اور اب تک کتنی

چوریاں کر چکا ہے تو مطلبی بتا بتا کر روہانسا ہو جاتا کہ وہ چور نہیں ہے بلکہ ایک مسافر ہے جسے مقدّر کی خرابی یہاں لے آئی ہے۔ بھلا اِس کی ان باتوں پر کون یقین کرتا۔ آخر اِسے یہ کہہ کر اندھیری کوٹھری میں ڈال دیا گیا کہ بادشاہ سلامت خود تمہارا فیصلہ کریں گے۔

اب شاکر کی سُنیے۔ وہ دولت نگر میں داخل ہوا تو دولت کی ریل پیل نے اس کو حیرت میں ڈال دیا۔ ہر طرف خوب صورت محل کھڑے تھے، جن کے رہنے والے سونے کی بگھیوں میں سوار آ جا رہے تھے۔ ہر طرف سنگِ مرمر کی شاہراہیں ایک جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ لوگوں کے لباس اتنے نفیس تھے کہ ان پر نگاہ نہ جمتی تھی۔ ابھی شاکر کھڑا اپنی حیرت پر ہی قابو پا رہا تھا کہ ایک سنہری بگھی ذرا دور آ کر رکی اور سامنے کے انتہائی شان دار محل سے خادموں کی ایک فوج باہر آ کر بگھی کے سامنے دست

بستہ کھڑی ہو گئی۔ شاہ راہ سے محل کے دروازے تک مخملیں قالین بچھا دیے گئے۔ بگھّی کا دروازہ کھلا اور ایک ٹھنگنا سا شخص باہر نکلا۔ اس کے بال برف کی مانند سفید تھے اور چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا تھا۔ دو خادموں نے اس کے دونوں بازو تھام رکھے تھے، پھر بھی وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ شاکر حیران تھا کہ اس شخص کو کیا پریشانی لاحق ہے، جس نے یہ حال بنا رکھا ہے۔ خادم اس معزّز شخص کو یونہی تھامے ہوئے محل میں لے گئے۔ شاکر نے آگے بڑھ کر ایک خادم کا بازو پکڑا جو تیزی سے اندر جا رہا تھا، اور پوچھا: "جناب، یہ کون ہیں؟"

اُس خادم نے شاکر کو عجیب سی نظروں سے گھورا: "مُسافر لگتے ہو؟"

"جی ہاں۔" شاکر نے کہا۔

"یہ دولت نگر کے وزیرِ اعظم ہیں۔" خادم نے جواب دیا اور بازو چھڑا کر

جانے کو تھا کہ شاکر نے پھر پوچھا : "لیکن یہ اتنے پریشان کیوں ہیں ؟"

تب خادم نے اس کو بتایا کہ بادشاہ سلامت نے وزیرِ اعظم کے ذمّے لگایا ہے کہ وہ ان کے گھوڑے کو کتاب پڑھنا سکھائے ورنہ اس کا سر قائم کر دیا جائے گا۔ اس کام کے لیے چھے مہینے کی مہلت دی گئی تھی۔ تین ماہ گزر چکے ہیں اور وزیرِ اعظم کی ہر کوشش ناکام رہی ہے۔ اب وہ روز بروز موت کو قریب آتے دیکھ رہا ہے اور پریشان سے پریشان تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ خادم تو چل دیا مگر شاکر اور بھی فکر مند ہو گیا۔ شاکر کا دِل چاہا کہ وزیرِ اعظم کی مدد کرے۔ اللہ نے اسے عقل و دانش عطا کی تھی۔ سو اس نے آگے بڑھ کر خادم کو پھر روکا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

تھوڑی دیر بعد شاکر وزیرِ اعظم کے سامنے کھڑا ساری تفصیل سُن رہا تھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ بادشاہ نے ایک نیا گھوڑا خریدا اور وزیرِ اعظم سے اس کے

متعلّق رائے طلب کی۔ ظاہر ہے کہ وزیرِ اعظم بادشاہ کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے گھوڑے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے، اور روانی میں یہ بھی کہہ گیا کہ حضور والا! مجھے یقین ہے کہ اس کو پڑھنا بھی سکھایا جا سکتا ہے۔ کہنے کو تو کہہ گیا مگر فوراً ہی غَلطی کا احساس ہوا۔ بادشاہ بھی تاڑ گیا کہ وزیرِ اعظم خوشامد کر رہا ہے۔ جھٹ حُکم صادر کر دیا کہ گھوڑے کو پڑھنا سکھایا جائے۔ وہ دِن اور آج کا دِن، وزیرِ اعظم بار بار یہی دہراتا ہے کہ زبان سے نکلی بات، کمان سے نکلا تیر اور گیا وقت لوٹ کر نہیں آتے۔ شاکر نے پوری بات سُن کر وزیرِ اعظم کو ایک ایسی تدبیر بتائی کہ وہ سُن کر حیران رہ گیا۔ خوش ہو کر اس نے شاکر کو اپنا خاص مشیر بنا لیا اور گھوڑے کو پڑھانے کی ذمّہ داری سونپ کر فکروں سے آزاد ہو کر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

آخر وہ دِن آ گیا جب بادشاہ سلامت اپنے گھوڑے کو پڑھتے دیکھنا چاہتے تھے۔

شاکر گھوڑے سمیت دربار میں حاضر ہوا۔ اسی دوران ایک اور مقدمہ بھی پیش ہونا تھا۔ دربار میں مطلبی چور کی حیثیت سے پیش ہوا تو شاکر حیران رہ گیا۔ قید خانے کے دِن رات نے مطلبی کی حالت خراب کر رکھی تھی۔ اس نے بھی شاکر کو دیکھ لیا تھا اور دِل ہی دِل میں نادم تھا۔ ویسے چاہتا تو تھا کہ

کہہ دے شاکر اس بات کا گواہ ہے کہ اس نے ہیرا چوری نہیں کیا، بلکہ راستے میں پڑا ملا تھا، مگر یہ سوچ کر ہمّت نہ پڑتی تھی کہ اس نے شاکر سے بہت بُرا سلوک کیا تھا۔ شاکر ہر گز گواہی نہ دے گا، اور میں لاکھ فریاد کروں فضول ہے کہ ایک چور کی کون سُنتا ہے۔

گو مطلبی کا فیصلہ پہلے ہوتا تھا لیکن بادشاہ سلامت گھوڑے کو مطالعہ کرتے دیکھنے کے لیے اس قدر بے تاب تھے کہ پہلے اس کو پیش کرنے کا حُکم صادر کر دیا۔

گھوڑا اور کتاب لائے گئے۔ گھوڑا اگلی ٹانگیں بچھا کر بیٹھ گیا اور ورق اُلٹنے لگا۔ بادشاہ اور دربار کے سب لوگ آنکھیں مل مل کر دیکھ رہے تھے گھوڑا واقعی پڑھ رہا تھا۔ یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ گھوڑا صفحے اُلٹتا رہا۔ تھوڑی دیر میں کتاب ختم ہو گئی تو وہ زور سے ہنہنا کر کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ سلامت نے وزیرِ اعظم کو مبارک باد دی کہ اس نے گھوڑے کو کتاب پڑھنا سِکھا دی۔ وزیرِ اعظم نے ادب سے شاکر کو پیش کر دیا کہ یہ وہ اُستاد ہے جس نے اس حیوان کو بھی یہ ہنر سکھا دیا۔ بادشاہ نے شاکر سے پوچھا کہ یہ کیسے مُمکن ہوا؟

شاکر نے ادب سے کہا : "حضورِ والا! بات آسان تھی۔ میں نے ہر صفحے پر گھاس رکھ کر گھوڑے کو پڑھنا سکھایا ہے۔ وہ روز گھاس کے شوق میں صفحہ اُلٹتا تھا۔ آج بھی یہی ہوا، مگر چوں کہ آج گھاس نہیں ملی اس لیے غُصّے سے ہنہنایا بھی۔"

بادشاہ ہنس پڑا اور کہا : "ہمیں تمہاری دانائی پسند آئی اے نوجوان! ہم آج سے تمھیں اپنے دربار میں شامل کرتے ہیں۔"

شاکر کے مُنہ سے بے اختیار نکلا : "اللہ تیرا شکر ہے۔"

بادشاہ اس بات سے اور زیادہ خوش ہوا اور کہا : "ہمیں تمہاری یہ عادت پسند آئی کہ تم ہمارے بجائے اللہ کا شُکر کرتے ہو۔ آج ہماری سمجھ میں بات آئی کہ در حقیقت تعریف صرف اسی کی ہے۔ آج سے ہم اعلان کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ ہمارے ہاتھوں کسی پر ظُلم نہیں ہوگا۔ اے نیک

صفت نوجوان مانگ آج کیا مانگتا ہے۔"

شاکر نے مطلبی کی طرف انگلی اُٹھائی : "حضور والا! اس کی معافی کا طلب گار ہوں۔"

بادشاہ کی آنکھیں غُصّے سے سُرخ ہو گئیں : "ایک چور کے لیے معافی!"

شاکر نے عاجزی سے کہا : "حضور والا یہ چور نہیں ہے۔ میں اس کا گواہ ہوں۔ اسے یہ ہیرے راستے میں پڑے ملے تھے۔ لالچ نے اسے اندھا کر دیا تھا۔"

پھر اس نے سب داستان بھرے دربار میں بیان کی تو مطلبی شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔

بادشاہ نے کہا : "ہاں ہمیں یاد آیا۔ ہم جب مہم سے لوٹ کر آ رہے تھے تو

تب یہ ہیرے گُم ہو گئے تھے۔ ضرور گر پڑے ہوں گے۔"

پھر بادشاہ نے حُکم دیا کہ مطلبی کو چھوڑ دیا جائے اور اِسے شاکر کا نوکر مقرّر کر دیا جائے۔ اِس طرح شاکر کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ نیّت ثابت منزل آسان۔

جادُوگر

ابرار محسن

بارشیں پھر نہیں ہوئی تھیں۔ آگ برساتے ہوئے سورج کی گرمی نے ندی، نالوں اور تالابوں کا پانی خُشک کر دیا تھا۔ اب ہریالی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جگہ جگہ سے چٹختی ہوئی سوکھی زمین تھی جس میں سے گھاس بھی سوکھ کر ختم ہو چکی تھی۔

نکھاٹا گاؤں کے لوگوں کو چشمے سے پانی لانے کے لیے پندرہ میل چلنا پڑتا اور اب تو وہ چشمہ بھی سوکھ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس سے مویشی بڑی تعداد میں مر رہے تھے۔ جگہ جگہ بکھرے ہوئے اِن کے پنجروں کو گِدھ نوچتے نظر آتے۔ ہر طرف ایک قیامت برپا تھی۔ نیلے بے داغ آسمان پر بادل کا نام تک نہ تھا۔

گاؤں والوں نے سردار سے کہا۔ "جادُوگر کو بلاؤ۔" جادُوگر بڑی طاقتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ وہ جھاڑ پھونک کرتا، بھوت بھگاتا۔ بیماریوں کا علاج کرتا اور گویا بارش بھی برساتا تھا۔ جب کبھی خشک سالی ہوتی جادُوگر کو بلایا جاتا۔ وہ ایک مکروہ شکل کا بُوڑھا تھا۔ اس کا جھرّیوں بھرا چہرہ بندر سے مشابہ تھا۔

بارش برسانے کا معاوضہ وہ دس موٹی تازی گایوں کی شکل میں پیشگی ہی

طلب کرتا تھا۔ پھر وہ مقدّس ناچ ناچتا اور ایڑیوں پر لٹّو کی طرح گھومنے لگتا۔ کبھی قلابازیاں کھاتا اور ہاتھ پیروں کو زور زور سے جھٹکتا۔ پھر وہ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر گاؤں والوں سے کہتا :

"آبا و اجداد کی روحیں تُم سے ناراض ہیں، اسی لیے اُنھوں نے بارش کو روک لیا ہے۔ تُم نے کسی بات سے اُنہیں غُصّہ دِلا دیا ہے۔ مُجھے مقدّس ناچ ناچ کر اُنہیں خوش کرنا پڑا۔ اب وہ بادلوں کو آسمان پر چھوڑ دیں گے اور بارش ہوگی۔ بارش ہونے سے پہلے میں تمہیں اطلاع دوں گا۔"

اِس کے بعد وہ گایوں کو ہانک کر لے جاتا۔ دس پندرہ دِن کے بعد وہ واپس آتا اور بارش کی خوشخبری دیتا اور بارش ہونے لگتی۔

کبھی کبھی وہ بالکل لوٹ کر نہیں آتا تھا اور کہلوا دیتا "روحیں تم سے بہت ناراض ہیں۔ انہیں راضی کرنے میں وقت لگے گا۔" ایسا اکثر ہوتا تھا۔

اُس دِن پھر گاؤں والوں نے سردار سے اصرار کیا کہ جادُوگر کو بلایا جائے۔

"میں جادُوگر کے پاس اپنا قاصد بھیجتا ہوں۔" سردار نے اُنہیں اطمینان دِلایا۔

گاؤں میں ایک لڑکا فیری رہتا تھا جو توہمات پر یقین نہیں رکھتا تھا، یعنی ایسی باتیں نہیں مانتا تھا۔ اُس نے سردار سے کہا۔ "کیا فائدہ ہوگا جادُوگر کو بُلانے سے؟ وہ بلاوجہ دس گائیں لے جائے گا۔ ارے جادُوگر محض ایک دھوکے باز اور ڈھونگی ہے۔"

سردار نے بگڑ کر کہا۔ "یہ کیا بکواس ہے؟ جادُوگر کی شان میں گُستاخی! جانتا نہیں یہ لوگ پُر اسرار قوّتوں کے مالک ہوتے ہیں اور روحوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہزاروں برس سے اِن کا اُونچا مقام رہا ہے۔"

فیری نے جواب دیا :

"یہ ہماری جہالت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سردار! تُم جانتے ہو میں پانچ برس تک دُور سمندر کے کنارے ایک شہر میں رہا ہوں۔ وہاں میری ملاقات دُور دراز ملکوں کے لوگوں سے ہوتی تھی جِن سے میں نے عقلمندی کی باتیں سیکھی ہیں۔ سنو، بارش برسانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ بارش کا سبب کُچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اس کا تعلّق فِطرت سے ہوتا ہے کبھی انسان کے حُکم سے پانی کی ایک بُوند بھی نہیں گرتی۔"

سردار اِس پر اور بھی جھلّا گیا اور بولا۔ "فیری! تُو نے گاؤں سے باہر جا کر قبیلے کی صدیوں پرانی روایت کو توڑا تھا اور اب تُو خطرناک قسم کے خیالات لے کر واپس آیا ہے۔ تو جادُوگر کو ڈھونگی بتاتا ہے۔ کیا تُو بزرگوں سے بھی زیادہ عقل رکھتا ہے۔ ہمارے بزرگ ایسے موقعوں پر جادُوگروں کی

قوّت کا سہارا لیتے چلے آئے ہیں۔ تو اپنے خیالات اپنے ہی پاس رکھ جادُوگر ضرور آئے گا۔ وہی بارش برسا سکتا ہے۔"

"بالکل غلط ہے۔" فیری نے نڈر ہو کر کہا۔ "وہ دھوکے باز تُم سے گائیں لے جاتا ہے۔ اور اگر بارش کے آثار نظر آتے ہیں تو تمہیں اطلاع کر دیتا ہے ورنہ گول کر جاتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اکثر وہ لوٹ کر نہیں آتا اور کہتا ہے کہ روحیں بہت زیادہ ناراض ہیں۔ وہ ہمیشہ بارش کیوں نہیں برساتا؟"

سردار اب بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ یہی کہتا رہا۔ "جادُوگر بڑی طاقت کا مالک ہے، تُو اِس قابل نہیں کہ اب اِس گاؤں میں رہ سکے۔ نکل جا اور کبھی واپس نہ لوٹنا۔ ایسے خطرناک خیالات رکھنے والوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

فیری بوجھل دِل کے ساتھ گاؤں سے چل پڑا۔

جادُوگر آ گیا۔

اس نے حسبِ معمول مقدّس ناچ ناچا، پھر کہا۔ "روحوں نے بادلوں کو قید کر رکھا ہے۔ مگر مُجھے دس گائیں دو میں بارش برساؤں گا۔"

وہ گائیں لے کر چلا گیا۔ بہت دِن گزر گئے۔ پانی کی ایک بوند بھی نہ گِری۔ کبھی کبھار بادل کا کوئی ننّھا ٹکڑا نیلے آسمان پر پھسلا چلا جاتا۔ فضا میں دھول چھائی رہتی اور سورج آگ برساتا رہتا۔ اب تو سردار بھی سوچنے لگا :

"کیا فیری سچ کہتا تھا؟ جادُوگر واقعی ڈھونگ ہے۔ کیا ہمارے بزرگ بھی دھوکے میں رہ؟ اب کیا ہوگا؟"

ایک شام فیری جادُوگر کو دی گئی دسوں گایوں کو ہنکاتا ہوا گاؤں میں داخل

ہوا اور سردار سے کہا : "یہ لو اپنی گائیں، جادُوگر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لایا ہوں۔ اور سُنو، میں نے آثار محسوس کر لیے ہیں۔ بارش ہونے والی ہے مگر اِس کا جادُوگر سے کوئی تعلّق نہیں۔ بارش کو ہونا ہی ہے۔ صرف چند دِن تک صبر کرو۔ اگر بارش نہ ہوئی تو سزا بھگتنے کو تیّار ہوں۔"

اُسی رات جادُوگر غصّے سے پھنکارتا ہوا آیا اور سردار سے کہا : "اِس گاؤں کا کوئی آدمی میری گائیں چُرا لایا ہے۔ واپس کرو نہیں تو بادلوں کو دس برس تک آسمان پر نہیں آنے دوں گا۔ تُم سب فنا ہو جاؤ گے۔ تُم میری طاقت سے واقف نہیں۔"

فیری نے کہا۔ "اب تو ہماری طاقت دیکھ۔ وہ آواز سُن!"

دُور اُفق میں بجلی کے کوندے کے ساتھ بادل گرج رہے تھے پھر آسمان

بادلوں سے ڈھک گیا۔ بوندا باندی کے بعد موسلادھار بارش ہونے لگی۔ لوگوں نے پتھرّ مار مار کر جادُوگر کو بھگا دیا۔ سردار نے بڑھ کر فیری کو کاندھے پر بٹھالیا اور جھُوم جھُوم کر ناچنے لگا۔

ایک بہن

مجیب ظفر انوار

"ظفری۔۔ ظفری۔۔۔ بات سنو۔" زبیر نے بے قراری سے ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "اونھ۔۔۔۔۔ ہم نے بُرا سا مُنہ بنایا اور آخری چھوارا مُنہ میں رکھ کر مُڑتے ہوئے بولے۔ "کیا بات ہے بھئی؟"

"ارے وہ سارہ۔۔۔۔۔؟" زبیر نے اُسی بوکھلائے ہوئے لہجے میں باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اب تو ہم بھی سٹپٹا گئے۔ "اللہ خیر کرے۔" ہم نے دِل میں کہا اور پھر چیخ کر پوچھا: "کیا ہوا سارہ کو کہاں ہے وہ؟"

"اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں سمجھے۔۔۔! وہ باہر دادی جان کے ساتھ مل کر انڈوں کا حلوا کھا رہی ہے۔ زبیر نے جل بھُن کر جواب دیا۔

"ہائیں۔۔۔۔" ہم بھونچکا رہ گئے۔ دِل میں آیا کہ زبیر کو ابھی رزلٹ سُنا دیں مگر پھر اپنے آپ پر قابو پا کر نرم لہجے میں بولے۔ "تو بھائی اس میں ایسی پریشانی کی کون سی بات ہے؟ وہ انڈوں کا حلوا کھا رہی ہے تو کھانے دو۔ کیا تمھارا بھی جی چاہ رہا ہے؟"

"جی کیوں نہیں چاہ رہا مگر سارہ نے تو پوچھا تک نہیں۔ دادی جان کے

جوڑوں میں درد تھا۔ اُنھوں نے دو درجن انڈوں کا حلوہ بنوایا اور اب سارہ اُن سے چپکی بیٹھی ہے اور حلوا اُڑا رہی ہے۔" زبیر نے بتایا۔

"یعنی آپ حلوا کھانا چاہ رہے ہیں!" ہم نے چھوارے کی گُٹھلی سے زبیر پر وار کرتے ہوئے پوچھا۔

"بد تمیز انسان، ذرا تمیز سے۔۔۔۔ میں حلوا کھاؤں یا نہ کھاؤں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جب سے میں نے اور تم نے اِس گھر میں آنکھ کھول ہے ہم تینوں بہن بھائیوں میں سارہ کو ہمیشہ اوّلیت دی جاتی ہے۔ وہ چاہے کھانے کا معاملہ ہو یا پہننے اوڑھنے کا ہمیشہ اُسی کی پسند پہلے پوچھی جاتی ہے۔ اب اور تو اور وہ ہمارے تمھارے معاملات میں بھی دخل اندازی کر رہی ہے۔" زبیر نے غصّے سے کہا۔

"دخل اندازی کر رہی ہے۔ مگر ہم نے تو ایسی کوئی بات محسوس نہ کی۔"

ہم نے کہا۔

"محسوس تو جب کرو گے جب کسی دِن وہ حلوے کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی صاف کر جائے گی۔ ظفری! جب اللہ عقل بانٹ رہا تھا تو لائن میں تم سب سے پیچھے تھے اور جب تمہاری باری آئی تو فرشتوں نے آئندہ مرتبہ کہہ کر معاملہ ہی ختم کر دیا۔ ارے بونگے، میری تیری عمر برابر ہی سمجھو۔ بھائی ہے میرا۔ یہ سارہ بھی ہم سے کون سی بڑی ہے، ایک دو برس اوپر ہوگی۔ کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ یہ سارہ کی بچّی اپنے ظالمانہ حقوق سے دست بردار ہو جائے۔" زبیر نے ہمارے قریب اگر کُچھ رازدارانہ کُچھ مخلصانہ لہجے میں کہا۔

"ارے واہ میں کیوں پاپا سے اپنی گردن نپواؤں۔ تم خود احتجاج کرو، دفع ہو جاؤ۔۔۔۔"

ہم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا زبیر کہاں ماننے والا تھا۔ وہ ہمارے سامنے آگیا اور دونوں ہاتھوں سے ہمارے ملائم بال اپنی مُٹھیوں میں جکڑ کے چیخ چِلّاتے ہوئے بولا۔ "ظفری میرے بھائی، یہ ایک بہن فساد کی پڑیا ہوتی ہے، حقوق پر ڈاکہ ڈال دیا ہے، اگر تُو میرا ساتھ نہیں دو گے تو تمھارے سر کے بالوں کی خیر نہیں۔۔۔۔۔" زبیر بلائے جان بن چکا تھا، اس لیے طوعاً و کرہاً ہم نے ہامی بھر لی۔ ہمارا اقرار سُن کر تو وہ اتنا خوش ہوا کہ بس، فوراً بولا:

"بس بس، پاپا کل صُبح کا ناشتا ہم لوگوں کے ساتھ کریں گے اور پھر تم جانتے ہو کہ وہ نوکری کے سِلسلے میں پورا ہفتہ شہر سے باہر رہیں گے۔ کل پاپا کے سامنے ناشتے کی میز پر ایک زوردار احتجاج ہونا چاہیے اور سارہ کے خلاف نعرے بُلند کر کے اُسے محبّت کی کُرسی سے اتروانا چاہیے۔ بولو

ٹھیک ہے ؟" زبیر نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب پیچھا چھوڑو۔" ہم نے زور سے کہا۔

زبیر کے جانے کے بعد ہم نے سوچنا شروع کیا کہ وہ درست کہ رہا تھا یا غلَط مگر جُوں جُوں ہم سوچتے گئے تُوں تُوں کڑی سے کڑی ملتی گئی اور ہم پر یہ رازفاش ہوا کہ ممّی، پاپا نے سارہ کے مُقابلے میں ہمیشہ ہماری حوصلہ شکنی کی تھی۔ یہی حال ہمارے ماموں ہی کے گھر کا تھا۔ اُن کے بھی دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی، وہاں بھی عالیہ نے راجا اور ندیم بھائی کے حقوق سلب کر رکھے تھے۔ ہم نے سوچا، واقعی ایک بہن فساد کی جڑ ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر ہم اُٹھے۔ زبیر کی ڈرائنگ کاپی سے ایک ورق پھاڑا اور موٹے قلم سے اس پر لکھ دیا:

"ایک بہن، فساد فساد۔"

اور اسی طرح کے چند دوسرے نعرے لکھ ڈالے۔ صُبح ہوئی تو زبیر بھاگا بھاگا ہمارے پاس آیا اور بولا، "ممّی، پاپا اور سارہ ناشتے کی میز پر موجود ہیں۔ جلدی چلو۔"

"ہاں چلو، یہ نعرے بھی اُٹھا لو۔ ہم نے رات میں لکھے ہیں۔" زبیر یہ دیکھ کر خُوشی سے جھوم اُٹھا۔

"ہمارے حقوق واپس کرو۔" یہ زبیر کی آواز تھی۔

"ایک بہن۔ فساد فساد۔" ہم بھی پہنچے۔

"سارہ باجی استعفیٰ دو۔" گھریلو نوکر بھی بولا، اُس کو رات کے کھانے پر مُرغ کی ٹانگ دے کر بڑی مُشکل سے اپنے ساتھ ملایا تھا۔ لہٰذا اس وقت کام آ رہا تھا۔

"لاحول ولا۔۔۔۔ ارے بیگم! کیا کوئی نئی تحریک احتجاجی جلسہ کر رہی ہے گھر میں۔۔۔ بہ قول شخصے۔" پاپا نے عینک ٹھیک طرح سے لگاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھ کر پوچھا۔ ممّی نے یہ سُن کر گہری سے پھنکار نما سانس بھری!

"اجی سُنئے! یہ کوئی تحریک نہیں، آپ کے گھر کے دو چشم وچراغ اور ایک یہ اللہ مارا شر فُو ہے جو میری بچّی کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں دفعہ ۱۴۴ کے تحت اِن سب کو اسٹور میں بند کر دوں۔"

" بیگم! اسٹور بند سے اچھّا ہے کہ اِن نالائقوں کو نظر بند کر دو۔" پاپا بولے۔ پھر فوراً ہی اُنہیں خیال آیا کہ اصل واقعہ تو پوچھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر ماجرا جاننے کے لیے وہ ہم سے ہمارے مسائل پوچھنے لگے۔ اب پردہ کیسا تھا۔ ہم نے کھُل کر اور چیخ چیخ کر اپنے حقوق مانگے۔

سارہ یہ سُن کر دنگ رہ گئی۔ ہمیں یاد ہے اُس کا توس ہاتھ ہی میں رہ گیا تھا۔ پھر وہ خاموشی سے اُٹھی اور اندر چلی گئی۔

وقت گزرا تو بات بھی آئی گئی ہو گئی۔ کسی نے بھی ہماری بے سر و پا حرکت کا نوٹس نہ لیا۔ اتّفاق کی بات کہ دو چار دِن بعد ہماری طبیعت سخت خراب ہو گئی۔ گُردے میں درد اُٹھا اور اتنا شدید کہ ہم بے ہوش ہو گئے۔

جب ہمیں ہوش آیا تو ہم نے گردن موڑ کر سر کو ہلانا چاہا۔ اچانک ٹپا ٹپ دو قطرے ہمارے چہرے پر گرے۔ ہم نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول کر دیکھا تو ہمارے چہرے کے عین اوپر سارہ کا چہرہ موجود تھا اور یہ بوندیں اُس کی آنکھوں سے ٹپکی تھیں۔ ہمیں ہوش میں آتا دیکھ کر وہ مارے خُوشی کے چیخ اُٹھی۔ اس کی بے پایاں خُوشی چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ وہ ہمارے بال اپنی انگلیوں سے سُلجھاتے ہوئے بولی :

"ایک بہن فساد کی جڑ ہوتی ہے نا!"

پھر وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ ہم نے بھی اپنی شرمندگی کے آنسو چھپانے کی خاطر چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔ یہ تو ہمیں بہت بعد میں پتا چلا کہ آپریشن کے بعد سے سارہ کا دو بوتل خون بھی ہماری رگوں میں دوڑ رہا

تھا۔

ختم شد